نئی نسل کا معمار اور تعمیر وترقی کا داعی

ماہنامہ

رفیقِ منزل

ISSN 2456-0375

جنوری-فروری ۲۰۲۰

ہندوستانی ادیان ومذاہب

عقائد–نظریات–ڈائلوگ

rafeeqemanzil.com
rafeeqemanzil

نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

ماہنامہ

جلد: ۳۳ شمارہ: ۱-۲ جنوری-فروری ۲۰۲۰ء جمادی الاوّل/ رجب ۱۴۴۱ھ

editor@rafeeqemanzil.com

مدیر

سعود فیروز

مدیر معاون

محمد معاذ

مجلس مشاورت

ابوالاعلی سید سبحانی (نئی دہلی)
محمد فراز (نظام آباد)
مبشر فاروقی (مہاراشٹر)
عبدالقوی عادل (اترپردیش)
ذکی احمد (مہاراشٹر)
نجم السحر (اترپردیش)
ایم ایم سلیم (مہاراشٹر)
فرحان اجمل (تلنگانہ)
اسماء فیروز (اترپردیش)
ناز آفرین (جھارکھنڈ)
اُسامہ اکرم (نئی دہلی)

MANAGER
ABDUL JABBAR
managerrmgp@sio-india.org

Asst. MANAGER
Saleem Akram 08867255364
asst.managerrmgp@sio-india.org

₹160 سالانہ | **₹15**

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Ph: 8447622919 | Email: officermgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Saud Firoz Ahmed**

مضمون نگار کے خیالات سے ادارہ یا تنظیم کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس شمارے میں استعمال کی گئیں تمام تصویریں بشکریہ Google.com

سایہ الٰہی کی طرف سبقت کرنے والے

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

پہلے اِس منظر کا تصور کیجیے: ایک چٹیل میدان ہو۔ شدید گرمی کا زمانہ ہو۔ سورج آگ برسا رہا ہو۔ اس میدان میں بہت سے لوگ جمع ہوں۔ وہیں کہیں پر چھوٹا سا سائبان ہو۔ اس وقت کیا ہوگا؟ ظاہر ہے، لوگ سایے کی تلاش میں سائبان کی طرف جائیں گے۔ جو لوگ دوڑ کر جائیں گے وہ وہاں جلد پہنچ جائیں گے۔ جو لوگ آہستہ چلیں گے وہ پیچھے رہ جائیں گے۔ پہلے پہنچنے والے دھوپ کی تمازت سے محفوظ ہو جائیں گے۔ بعد میں پہنچنے والوں کو جگہ نہیں ملے گی۔

اب میدانِ حشر کا تصور کیجیے۔ وہاں دنیا کے تمام انسان جمع ہوں گے۔ سوج سر پر ہوگا۔ اس کی حرارت وتمازت سے سب پریشان ہوں گے۔ وہ سایہ کے متلاشی ہوں گے، جس سے انھیں کچھ راحت مل سکے۔ لیکن وہاں کہیں سایہ نہ ہوگا، سوائے سایہ الٰہی کے۔ اس وقت اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوں گے جو دوڑ کر اس سایے میں پہنچ جائیں گے۔ اس طرح وہ عافیت میں ہو جائیں گے۔

روزِ قیامت سایہ الٰہی سے بہرہ ور ہونے والے کون ہوں گے؟ بعض احادیثِ نبوی میں ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اس مضمون کی ایک حدیث ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب نے سوال کیا:

"أَتَدْرُونَ مَنِ السَّابِقُونَ إِلَى ظِلِّ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟"

ترجمہ: کیا تم لوگ جانتے ہو کہ روزِ قیامت اللہ عزّ وجل کے سایے میں سب سے پہلے پہنچ جانے والے کون ہوں گے؟

صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "الَّذِينَ إِذَا أُعْطُوا الْحَقَّ قَبِلُوهُ، وَإِذَا سُئِلُوهُ بَذَلُوهُ، وَحَكَمُوا لِلنَّاسِ كَحُكْمِهِمْ لِأَنْفُسِهِمْ". (مسند أحمد: 24379)

"یہ وہ لوگ ہوں گے جنھیں حق دیا جائے تو اسے قبول کرلیں اور جب ان سے حق مانگا جائے تو (شرحِ صدر کے ساتھ) اسے پورا پورا دیں۔ اور جب لوگوں کے لیے کسی چیز کا فیصلہ کریں تو ویسا ہی فیصلہ کریں جیسا اپنے لیے کرتے۔"

اس حدیث میں دو اہم باتیں بتائی گئی ہیں۔ انسانی زندگی میں ان کی بڑی اہمیت ہے، لیکن کم ہی لوگ ہیں، جن کو ان پر عمل کی توفیق مل پاتی ہے۔ جو اہلِ ایمان یہ دونوں صفات اپنے اندر پیدا کرلیں انھیں اس حدیث میں بشارت دی گئی ہے کہ وہ روزِ قیامت میدانِ حشر میں سایہ الٰہی سے فیض یاب ہوں گے، جب کہ اس کے علاوہ وہاں اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔

پہلی صفت یہ ہے کہ آدمی جس طرح اپنا حق وصول کرنے میں پھرتی دکھاتا ہے اسی طرح کوئی اس سے اپنا حق مانگے تو اس کی ادائیگی میں بھی سرعت دکھائے۔ اپنا حق حاصل کرنے میں تو خوب تیزی دکھائی جائے، وقت پر نہ ملے یا پورا نہ ملے تو شکایت کی جائے اور اپنی حق تلفی کا رونا رویا جائے، لیکن جب دوسرا اپنا حق مانگے تب اس کی ادائیگی میں سستی دکھائی جائے، ٹال مٹول سے کام لیا جائے یا پورا حق نہ دیا جائے۔ یہ درست ایمانی رویّہ نہیں ہے۔ حدیث میں 'بَذَلُوهُ' کا لفظ آیا ہے، جس میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے۔ اس میں خوش دلی کے ساتھ دینے کے معنی پائے جاتے ہیں۔

دوسری صفت یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے معاملے میں وہی رویّہ اختیار کرے جو وہ اپنے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔ دوسروں کے معاملات میں وہی فیصلہ کرے جو وہ اپنے کسی معاملے میں چاہتا ہے۔ عموماً اس سلسلے میں توازن قائم نہیں رہ پاتا۔ آدمی دو پیمانے بنالیتا ہے۔ ایک پیمانے سے دوسروں کے لیے ناپتا ہے اور دوسرے سے اپنے لیے۔ دوسروں کے لیے کچھ فیصلہ کرتا ہے اور اپنے لیے کچھ۔ یہ بھی درست اسلامی رویّہ نہیں ہے۔

جو لوگ اپنے اندر یہ دو صفات پیدا کرلیں وہ ایسے خوش نصیب ہیں جو لازماً روزِ قیامت عرشِ الٰہی کے سایے میں ہوں گے۔ جسے بھی سایہ الٰہی حاصل کرنے کی خواہش ہو اسے اپنے اندر یہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

زندگی بے بندگی شرمندگی

انسان کی زندگی کا رخ متعین کرنے میں اس کے مذہبی عقائد کا کردار بڑا اہم ہوتا ہے۔ موت وحیات سے متعلق فرد و جماعت کا عقیدہ اسے ایک خاص طرز زندگی اپنانے پر آمادہ کرتا ہے۔ دنیا میں فی زمانہ جتنی اہم تہذیب وتمدن ہیں ان سب کی پشت پر عقائد وایمانیات کی مضبوط بنیاد موجود ہے۔

فرد وسماج کی اصلاح کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کن نظریات وایمانیات کا نام لیوا ہے۔ نیز زندگی اور موت اور دوسرے مابعد الطبعیاتی پہلوؤں پر اس کی کیا نظر ہے۔ ان معلومات کے بغیر اصلاح وترتیب کے لیے اٹھایا جانے والا ہر قدم نقش بر آب ثابت ہوسکتا ہے۔ مذہب زندگی کے تمام شعبوں اور سماجی ڈھانچے کو براہِ راست متاثر کرتا ہے۔ اس ضمن میں عماد الحسن آزاد فاروقی لکھتے ہیں کہ 'مذہبی زندگی میں مذہب کے باطنی احساس اور مذہبی تجربہ کی مرکزی اور اَساسی حیثیت کے باوجود مذہب کا تاریخی، سماجی اور تمدنی اظہار اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ علوم وفنون اور سیاسی ومعاشی زندگی پر بھی مذہب کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں مذہبی احساس سے قدروں کے تعلق کی بحث خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مذہبی احساس کی بنیاد پر ہی وہ مستقل قدریں قائم رہ سکتی ہیں جو انسانی رشتوں کو باہمی اعتماد اور استقلال عطا کرتی ہیں۔ انسانی سماج میں انسانی رشتوں پر اعتماد کی ضرورت ظاہر ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں سماجی زندگی کی سب سے بنیادی اکائی یعنی خاندان کا قائم رہنا بھی مشکل ہے۔ چنانچہ ماہرین عمرانیات کی نظر میں سماجی اعتبار سے مذہب کا سب سے اہم کردار یہی ہے کہ وہ سماج کو ایسی قدریں اور ادارے دیتا ہے جو سماجی زندگی کے قیام، استحکام اور استمرار کے لیے ضروری ہیں'۔ (دنیا کے بڑے مذہب، ص ۱۱)

قرآن اس حقیقت کی طرف رہ نمائی کرتا ہے کہ اس کائنات کے خالق نے ابتدا ہی سے انسانوں کی ہدایت ورہ نمائی کا سامان مہیا کر رکھا ہے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کو زمین میں بساتے ہوئے یہ اعلان کر دیا گیا:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرۃ:۳۸)

''پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔''

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر یہ صراحت بھی کر دی گئی کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے سلسلے کو قائم رکھا یہاں تک کہ کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں رہ گئی جہاں کوئی مصلح وہادی یا اس کی تعلیمات نہ پہنچی ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد:۷)

''اور ہر قوم کے لیے ایک رہ نما ہے۔''

لیکن ہوا یہ کہ اللہ کے بندوں نے اصل تعلیمات کو بھلا دیا اور ظن وگمان کی پیروی کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے بہت سے ناخدا بنا لیے اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ انسانوں کو ان کی اصل سے آگاہ کرانے کے لیے یہ پہلو بھی اہم ہے کہ ہم ان کے عقائد کا معروضی مطالعہ کریں تا کہ تشنگی واضح ہو سکے۔ مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انسان کو اپنے کم زور ہونے اور بندہ ہونے کا احساس کسی نہ کسی صورت میں رہا ہے۔ یہی احساس اسے بندگی رب کے لیے آمادہ کرتی ہے اور جب وہ اپنے رب کا ذکر کرتا ہے تو اس کے قلب کو سکون حاصل ہوتا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد:۲۸)

''خبر دار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔''

آج جب کہ دنیا کی بیش تر آبادی اپنے رب کو بھلائے بیٹھی ہے، اہلِ ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ خدا سے غافل بندوں تک پیغامِ حق پہنچائیں تا کہ دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن سکے۔ —— محمد معاذ

اقوام عالم میں مذہبی پیشوائیت کی روایت

رضوان الٰہی

مذہبی پیشوائیت (Priesthood) اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے مذاہب عالم میں بالعموم اور یہودیت، ہندومت اور مسیحیت میں بالخصوص پائی جاتی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا تصور تو پرانا ہے، مگر اسے بطور نظامِ حکومت کلیسیا نے یورپ میں رائج کیا۔ اس اصطلاح کے لیے انگریزی لفظ Priest استعمال کیا جاتا ہے، جو یونانی لفظ پرسبٹرس Presbyteros سے مشتق ہے۔ اس کا مطلب ہے بڑا یا بزرگ۔ یہ لاطینی زبان کے لفظ Sacerdos سے معنوی اعتبار سے ملتا جلتا ہے جو کسی مذہبی تقریب یا عبادت میں پادری کا فریضہ سر انجام دینے والے فرد کے لیے مستعمل ہے۔ اس ضمن میں Dennis Chester Smolarski کا کہنا ہے کہ انگریزی میں استعمال ہونے والا لفظ Priest دراصل لاطینی زبان کے لفظ Presbyter اور یونانی کے Presbuteros سے ماخوذ ہے، جب کہ ایک رائے کے مطابق لاطینی لفظ Sacerdos اور یونانی لفظ Hiereus بھی اس کا ماخذ قرار پاتے ہیں۔ یونانی زبان میں Presbuteros کا معنی ایسا جہاندیدہ بزرگ جو قبیلہ کی رہ نمائی کر سکے۔ ۱؎ 'پیشوا' فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کا معنیٰ فرہنگ آصفیہ میں نمونہ، رہبر اور امام کیا گیا ہے، جب کہ مرہٹوں کیمورث اعلیٰ بالاجی کو بھی پیشوا کہا گیا ہے۔ ۲؎ سید تصدق حسین نے لغات کشوری میں پیشوا کا معنیٰ رہ نما اور ہادی کیا ہے۔ ۳؎

مذہبی پیشوا کے لیے انگریزی زبان میں Sacerdot بھی استعمال ہوتا ہے۔ معروف ڈکشنری Chambers Dictionary میں اس کے مشتقات کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ لاطینی زبان کے لفظ Sacerdos یا Sacerdotis سے ماخوذ ہے اور اپنی اصل میں لاطینی لفظ Sacer سے مشتق ہے۔ اسی طرح Sacerdos سے انگریزی زبان میں اسم صفت کے طور پر Sacerdotal اور Sacerdotalism بھی استعمال ہوتا ہے۔ Sacerdotalism اپنے معنیٰ میں مذہبی پیشوائیت کے وسیع تر مفہوم کو شامل ہے، جو مذہبی پیشوا کے لوگوں کی سوچ اور اعمال پر مکمل تسلط کو ظاہر کرتا ہے۔

کتاب مقدس میں مذہبی پیشوا کے لیے استعمال کیے جانے والے لفظ 'کاہن' کے بارے میں پادری ایف ایس خیر اللہ نے لکھا ہے:

> Priest کا ترجمہ عموماً 'کاہن' کیا جاتا ہے اور کاہن کے لیے عہدنامہ جدید میں ایک اور لفظ Hiereus بھی استعمال ہوا ہے، جس کا تعلق Hieros سے ہے یعنی پاک۔ اس

سے مراد وہ مخصوص شخص ہے جو پاک کاموں میں مصروف ہو۔ عبرانی لفظ کوہن Kohen کے اشتقاق کا علم نہیں ہوسکا، لیکن شروع میں اس سے مراد ایسا شخص لیا جاتا تھا جس کا تعلق غیب بینی اور علم الہیات سے ہو۔[5]

مذہبی پیشوا کے لیے ایک اور مستعمل لفظ Minister ہے۔ یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں گرجا گھر یا عبادت گاہ میں موجود ایسے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو قربانی کی رسم کو انجام دیتا ہو یا اسے انجام دینے والے کی رہ نمائی کرتا ہو۔ چیمبرڈ کشنری میں Minister سے متعلق لکھا ہے کہ یہ لفظ لاطینی زبان سے انگریزی میں آیا ہے۔ لاطینی زبان میں یہ لفظ Minorless سے مشتق ہے۔[6]

ان تعریفات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مذہبی پیشوا تاریخ کے مختلف ادوار اور ہر عہد کی مخصوص تہذیب وتمدن کے پس منظر میں ایسا شخص قرار پاتا تھا جو عمر میں بڑا یا بزرگ ہو۔ قدیم دور میں مذہبی پیشوا کا عہدہ جسے تفویض کیا جاتا تھا اس سے ایسی غیر معمولی صلاحیتیں اور اوصاف وابستہ کیے جاتے تھے جن کے مطابق وہ قدرت کے رازوں کا امین اور دستور الہیہ کا ترجمان ہو۔ مذہبی پیشوا سے سے بھی موسوم کیا جاتا تھا جو خیر وبرکت اور نیکی کے کاموں میں مشغول رہتا ہو، جیسا کہ مذہبی تقاریب، تہوار یا عبادت میں راہ نمائی کا فریضہ سرانجام دینا اور بالخصوص مذہبی قربانی کی رسم کو انجام دینا یا اسے انجام دینے والے کی معاونت کرتا ہو، دیوتا کا خدمت گار ہو اور ایسی روحانی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو جو اسے لوہی صفات کی حامل ہستی کے اسرار منکشف کرنے پر مہمیز کرسکیں۔ معاشرے کے ارتقاء کے ابتدائی مرحلے پر اکثر بادشاہ اور مذہبی پیشوا کی ذات مافوق الفطرت ہستی یا خدائے مجازی تصور کی جاتی تھی۔ اس عقیدے کے مطابق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ فطرت کم وبیش اس کے تابع ہے۔ شاہی لقب سے مذہبی فرائض کی وابستگی قدیم اٹلی اور یونان میں ایک عام چیز تھی۔ دینی اور دنیوی اقتدار کا جو امتزاج اٹلی اور یونان میں دیکھا گیا وہ تقریباً مختلف مقامات پر مختلف ادوار میں موجود رہا ہے۔ اس شاہی وروحانی امتزاج کے بارے میں James George Frazer نے لکھا ہے:

''شاہی لقب اور مذہبی فرائض کا امتزاج نیمی کپجنگل کے بادشاہ، روم کے شاہ قربانی اور ایتھنز کے اس مجسٹریٹ کی ذات تک محدود نہ تھا جو بادشاہ کہلاتا تھا، بلکہ یہ چیز قدیم ادوار میں بھی وحشت وجاہلیت سے لے کر تہذیب وشائستگی تک، ہر مرحلۂ ارتقا پر معاشروں کی ایک عام خصوصیت رہی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی راہ نما کا یہ شاہانہ منصب فقط نام کی بادشاہت نہ تھی، بلکہ وہ حقیقت میں بہ یک وقت مذہبی اور شاہی دونوں قسم کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔''[7]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی پیشوا اور ریاست کے سربراہ کے لیے قدیم ادوار میں ایک ہی فرد ذمہ دار ہوتا تھا جس کی ذمہ داریاں مختلف ادوار اور مختلف معاشروں کے رسم ورواج اور حالات وواقعات کی بنا پر گونا گوں رہی ہیں۔ ان میں مذہبی شعائر کی ادائیگی، جھاڑ پھونک کرنا، بیماریوں کا تدارک اور علاج معالجہ مختلف مذاہب کے مخصوص سیاق وسباق، ماحول اور ضروریات کے مطابق مختلف انداز میں مذہبی پیشوا ادا کرتے رہے ہیں۔ بہر حال کہا جاسکتا ہے کہ اپنے لوگوں کا تحفظ اور بچاؤ کرنا اور روبہ زوال جسمانی اور روحانی سکون کو بحال کرنا یہ وہ تمام امور ہیں جو مذہبی پیشوا کی ذمہ داریوں کا مرکزی محور رہے ہیں۔

> توحید کے نور سے دور ہونے کے بعد نسل انسانی کے بعض گروہ جن تاریک اور اندھیری راہوں کے مسافر بنیاں گھاٹیوں میں سے ایک شاہ پرستی بھی رہی ہے۔ اور قدیم زمانے کے بادشاہ بالعموم مذہبی بادشاہوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن محض یہ کہہ دینے سے ان کے منصب کے مذہبی پہلو کا حق ہرگز ادا نہیں ہوتا۔

احتیاج پیشوائیت

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ غیر متمدن اور غیر مہذب قبائل میں مذہبی پیشوا فقط مذہبی رسوم کی انجام دہی اور ماورائے فطرت قوتوں سے رابطے تک ہی محدود نہ تھے، بلکہ وہ ساحر اور جادوگر وغیرہ بھی ہوا کرتے تھے۔ مذہبی پیشوا، ساحر اور کاہن انسانی تاریخ کے ہر عہد اور ہر معاشرت میں نہ صرف موجود رہے ہیں بلکہ انہوں نے انسانیت کے ماتھے پر گہرے نقوش بھی ثبت کیے ہیں۔ تاریخ کے ایوانوں میں جھانکنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسی انتہائی غیر متمدن اقوام جن کے بارے میں عمومی تاثر یہ تشکیل پاتا ہے کہ وہ حیوانی سطح پر ہی زندگی بسر کرتی تھیں اور انہیں کسی روحانی بالیدگی، نمو یا احتیاج کے تصور کا شائبہ تک نہ تھا، ان اقوام میں بھی مذہبی پیشوا اور مذہب کی ضرورت

پائی جاتی تھی یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ انسانی سماج، معاشرے کی تشکیل اور ارتقاء کی غیر منظم سادگی سے منظم پیچیدگی کی جانب مسلسل پیش رفت سے بھی پہلے مذہبی پیشوائیت کی ابتدا ہو چکی تھی۔

توحید کے نور سے دور ہونے کے بعد نسل انسانی کے بعض گروہ جن تاریک اور اندھیری راہوں کے مسافر بنیان گھاٹیوں میں سے ایک شاہ پرستی بھی رہی ہے۔ اور قدیم زمانے کے بادشاہ بالعموم مذہبی بادشاہوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن محض یہ کہہ دینے سے ان کے منصب کے مذہبی پہلو کا حق ہر گز ادا نہیں ہوتا۔ ان دنوں وہ آسمانی طاقت جو بادشاہ کی محافظ تصور کی جاتی، تیت ایک عقیدے کی حیثیت رکھتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور میں بھی اس وقت کے بادشاہ نے خدائی کا دعوی کیا تھا، جسے قرآن کریم میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَاجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (البقرة:۲۵۸)

(کیا تم نے اُس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا؟ اِس بات پر کہ اُس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اُس نے کہا: زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا: اچھا! اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا، مگر اللہ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا۔)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

ازمنہ قدیم سے آج تک تمام مشرکین کی یہ مشترک خصوصیت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالی کو رب الارباب تو مانتے ہیں مگر صرف اسی کو تنہا معبودِ مطلق نہیں مانتے۔ روز اول سے لے کر آج تک تمام مشرک معاشرے خدائی کو دو حصوں میں تقسیم کرتے آئے ہیں: ایک فوق الفطری خدائی جو سلسلہ اسباب پر حکم ران ہے، جس کی طرف انسان اپنی مشکلات میں دستگیری کے لیے رجوع کرتا ہے۔ اس خدائی میں مشرک اللہ تعالی کے ساتھ ملائکہ، جنات، ارواح اور مختلف مظاہر فطرت سمیت بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں، ان سے دعائیں مانگتے ہیں، ان کے آستانوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ دوسری خدائی کی قسم تمدنی اور سیاسی معاملات سے تعلق رکھتی ہے، یعنی حاکمیت اور زندگی بسر کرنے کیلیے قوانین مقرر کرنے کی مجاز اتھارٹی، جسے دنیوی معاملات میں فرماں روائی کے مطلق اختیارات حاصل ہوں اس قسم کی خدائی کو دنیا کے تمام مشرکین نے ہر زمانے میں اللہ تعالی کی ذات سے سلب کر کے، یا اللہ تعالی کے ساتھ شاہی خاندانوں اور مذہبی پیشواؤں اور معاشرے کے بڑے لیڈروں میں تقسیم کیا۔ اکثر شاہی خاندان اس دوسرے معنی میں خدائی کے مدّعی ہوئے ہیں اور اوراسے مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے بالعموم پہلے والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریک سازش رہے ہیں نمرود کا دعویٰ خدائی بھی اسی دوسری قسم کا تھا۔ ۸۔

قدیم مصر کے فرعون بادشاہ کے ساتھ خدا بھی تسلیم کیے جاتے تھے۔ وہ لوگوں کو اپنی خدائی تسلیم کرنے پر مجبور کرتے تھے اور انکار کی صورت میں جیل کی کوٹھری یا قید حیات سے آزادی کی دھمکیاں بھی شامل تھیں۔ اسی پس منظر میں حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے فرعون کی بابت قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (الشعراء:۲۹)

(فرعون نے کہا اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔)

اکثر شاہان وقت یہ دعویٰ نہیں کرتے تھے کہ وہ اس کائنات کے خالق اور مدبّر ہیں اور اسباب عالم کے سارے سلسلے پر انہی کی حکومت چل رہی ہے، بلکہ انہیں اپنے علاقے کے حاکم مطلق ہونے کا دعویٰ ہوتا تھا کہ میرا کہا قانون ہے اور میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار کی حامل ہستی نہیں ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ مصر میں میرے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ اگر میری حاکمیت کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کی تو جیل خانہ تیار ہے۔ ۹۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ()

(اور فرعون نے کہا: اے اہلِ دربار، میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہامان! ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا، شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰؑ کے خدا کو دیکھ سکوں میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔)

اس آیت کی تشریح مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے لکھا ہے:

’’کا کہنا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام محکوم اور رعایا قوم کے فرد تھے اور ان کا مقابلہ ایسے خودمختار بادشاہ سے ہو رہا تھا جس کا کہا ہی قانون کا درجہ رکھتا تھا اور جو آمر مطلق ہی نہیں، بلکہ ملک کی اکثریت کے عقیدے کے مطابق معبود والہ (سب سے بڑے دیوتا کا اوتار) بھی تھا۔ اہلِ مصر کے عقیدے کے مطابق فراعنۂ مصر کی نسل خدائی اوتار تھی اور بادشاہ سب سے بڑے دیوتا ’سورج‘ کا زندہ نمائندہ ہوتا تھا۔ ۱۰۔

فرعون نے کہا تھا:

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النازعات: ۲۴)

(میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔)

مولانا عبدالحق حقانی نے کا مذکورہ آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھا ہے:

’’فرعون اور اہل مصر بت پرست تھے، مگر فرعون اپنی سرکشی اور خصوصاً موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنے زور و قوت جتانے کے لیے لوگوں کے سامنے کہتا تھا کہ میں بڑا رب ہوں۔ تمہاری پرورش میرے ہاتھ میں ہے جس کو جتنا چاہوں عطا کروں اور جسے چاہوں سزا دوں میرے علاوہ اختیار کس کو ہے؟ اصل میں فرعون اللہ تعالیٰ کے وجود کو محسوس نہ کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو عقلِ کل اور ربِّ اعلیٰ سمجھتا تھا۔ ازمنہ قدیم میں ہندوستان اور مصر میں یہی دستور تھا۔‘‘ ۱۱۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب ایسے مطلق العنان حکم رانوں کو اقتدار نصیب ہوا جن کی خود پسندی اور کوتاہ بینی ان کو اپنی ذات سے آگے کچھ نہیں دیکھنے دیتی تھی تو ان کو کاسہ لیس وزیروں اور ابن الوقت مشیروں نے ظل الٰہی کا مقام دے ڈالا اور ان کو خدائی صفات کا حامل قرار دے دیا۔ انسانی تمدن کے ابتدائی خدوخال میں نظر آتا ہے کہ بہت سی صورتوں میں بادشاہوں کے تقدس کی بنا محض ان کی مذہبی پیشوائی نہ تھی، بلکہ ان کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ خود دیوتا ہیں اور اپنی رعایا اور اپنے پرستاروں پر ان برکتوں کے نازل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں جو عام طور پر انسان کی دست رس سے باہر سمجھی جاتی ہیں اور ضرورت کے وقت عبادت اور قربانی کے ذریعے صرف فوق الفطرت اور غیر مرئی طاقتوں سے طلب کی جاتی ہیں۔ چناں چہ بادشاہوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ وقت پر بارش برسائیں، دھوپ نکالیں اور فصلوں کی نشوونما کریں۔ شاہان وقت سے وابستہ توقعات سے متعلق Frazer نے لکھا ہے:

> " Kings were revered, in many cases not merely as priests, that is, as intercessors between man and god, but as themselves gods, able to bestow upon their subjects and worshippers those blessings which are commonly supposed to be beyond the reach of mortals, and are sought, if at all, only by prayer and sacrifice offered to superhuman and invisible beings."

> (زیادہ تر بادشاہوں کو دیوتاؤں اور مخلوق کے درمیان وسیلہ بننے والے مذہبی پیشواؤں کی حیثیت میں ہی تعظیم نہیں دی جاتی تھی، بلکہ وہ اپنی ذات میں دیوتا تصور کیے جاتے تھے جو اپنی رعایا اور پرستاروں پر عنایات نازل کرنے کی قدرت رکھتے تھے، وہ عنایات جو عام طور پر فانی انسانوں کی دست رس سے باہر تصور ہوتی ہیں اور انہیں صرف غیر مرئی وجود اور ماورائے ادراک قوتوں کے حضور عبادت اور قربانی کے ذریعہ ہی دست یاب ہو سکتی ہیں۔)

غیر تہذیب یافتہ اقوام اور وحشی قبائل کی اس سوچ نے کہ وہ دیوتاؤں تک براہ راست اور بلاواسطہ رسائی کی اہلیت نہیں رکھتے مذہبی پیشواؤں کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ تسلیم کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ گویا مذہبی پیشوا وہ واحد سہارا اور نگہبان تھے جن کے بغیر ان نادان لوگوں کی بدقسمتی، بدنصیبی، تباہی اور بدبختی میں کوئی شک نہ رہ جاتا اور نہ وہ دیوتاؤں کے غیظ و غضب سے بچ سکتے۔

مختلف ادوار میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات میں مذہبی پیشواؤں کی ضرورت و حاجت اس لیے پیدا ہوئی کہ ان کے بارے

میں یہ گمان کرلیا گیا تھا کہ وہ رزق کی فراہمی میں مددگار ہیں۔ انسان کے لیے اپنے ابتدائی دور میں رزق کا ذریعہ چوں کہ کاشت کاری تھا اس لیے مذہبی پیشواؤں کے بارے میں یہ سوچ لیا گیا کہ وہ فصلوں کی بہتر نشو نما کے لیے ہواؤں اور بارشوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر جب انسان نے قدرے ترقی کی اور مختلف اوزار بنا لیے اور شکاری زندگی کا آغاز ہوا تو ماہی گیری اور شکار میں کام یابی مذہبی پیشوا کی رہین منت سمجھی گئی، پھر بیماروں کا علاج معالجہ، مستقبل میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی پیش گوئی اور دشمنوں کے خلاف استعانت بھی مذہبی پیشواؤں کا فریضہ ٹھہری۔ اور کچھ کسر مذہبی تعلیمات کی من مانی تفسیر نے پوری کر دی۔ مارمن کتاب مقدس ۱۳ے میں کہا گیا ہے:

> " And also all they who receive this priesthood receive me, saith the Lord."
>
> (خداوند نے کہا: اور ان سب نے جنہوں نے کہانت یا مذہبی پیشوائیت کو قبول کرلیا انہوں نے مجھے قبول کرلیا۔)

مذہبی پیشواؤں نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اس بات کو یوں تعبیر کیا کہ مذہبی پیشوا جو حکم دے رہا ہے اس پر بلا تامل صاد کرنا چاہیے، جیسے کہ وہ خود خداوند کا حکم ہو، حالاں کہ اس پر تھوڑا سا غور کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ الوہی ہستی کے حکم اور فانی انسان کے حکم کو ہرگز برابر پلڑوں میں نہیں تولا جا سکتا۔

آغاز و ارتقاء

اگر مذہبی پیشوا کے تقرر کی اہلیت وصلاحیت کو دیکھا جائے تو یہ عہدہ یا منصب بعض مذاہب اور اقوام میں موروثی اور خاندانی لحاظ سے بھی دوسرے فرد کو منتقل ہوتا رہا ہے، جیسے کہ ہندومت، یہودیت اور مجوسیت میں یہ روایت چلی آ رہی ہے۔ گویا مذہبی پیشوا کے لیے ضروری ہے کہ اس کا تعلق کسی مخصوص خاندان یا نسل سے ہو، جب کہ قدیم روم میں یہ منصب ایک سے زیادہ امیدوار ہونے کی صورت میں مقدس کنواریوں میں انتخابی عمل کے ذریعے تفویض کیا جاتا تھا۔ مارمن حضرات کے نزدیک کہانت یا مذہبی پیشوائی کا آغاز ابتدائے آفرینش سے ہی ہو گیا تھا۔ ان کی کتاب مقدس میں ذکر ہے:

> ''This high priesthood being after the order of his Son, which order was from the foundation of the world''15
>
> (کہانتِ عظمیٰ اس [خداوند] کے بیٹے کے حکم سے جاری ہوئی، اس حکم سے جو کائنات کی تخلیق سے متعلق تھا۔)

مسیحیت کے ابتدائی دور سے لے کر اس کے عروج و زوال تک مسیحیت کا روم سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اس نے جو روایات رومی تہذیب سے مستعار لیں ان میں سے ایک پوپ کے انتخاب کی بھی ہے۔ چنانچہ یہی روایت مسیحیت میں مذہبی پیشوا کے انتخاب کے لیے آج بھی جاری ہے اور پوپ کا انتخاب کارڈینلز کی خفیہ رائے دہی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ کچھ مذاہب ایسے بھی ہیں جن میں مذہبی پیشوا کا تعین تناسخ ارواح یا تجسیم نو کے عقیدے کی بدولت عمل میں لایا جاتا ہے، جیسے کہ تبت میں لاما۔ ان کے بارے میں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ لاما کے انتقال کرنے کے بعد اس کی روح نئے لاما کے جسم میں واپس آ جاتی ہے۔ ایسا ہی عقیدہ ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے۔ Tsem Tulku Rinpoche اپنی کتاب میں ذکر کرتا ہے کہ بڑے لاما Yeshe کے پوری دنیا میں ظاہر ہونے کے سینکڑوں مقامات ہیں۔ حال میں ہی اس کی تجسیم ایک اسپینی لڑکے میں ہوئی، جس کی عمر بیس برس کے قریب ہے۔ ایسی ہی تجسیم ہانگ کانگ، تائیوان اور نیوزی لینڈ میں بھی ہوئی ہے۔ لاما اپنے ادھورے کاموں کی تکمیل کے لیے پوری دنیا میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔۱۶ے اسی طرح Warwick Ball کے مطابق ویدک دور کے برہمن اور قدیم اسرائیل کے کاہن اور لاویوں میں سماجی حیثیت اور مقام و مرتبے کا تعین وراثتی یا نسلی اعتبار سے کیا جاتا تھا۔ کسی بھی

فرد کی بہ طور مذہبی پیشوا کے حیثیت کا تعین سراسر اس کے آباء واجداد کی طرف سے ملنے والی وراثت پر ہوتا تھا۔ مجوسیت میں بھی مذہبی پیشوا موروثی ہوتا ہے۔ ۱۷؎

گزشتہ صفحات میں اجمالی طور پر ذکر کیا گیا ہیکہ شاہی لقب سے مذہبی فرائض کی وابستگی قدیم اٹلی اور یونان میں ایک عام چیز تھی۔ اسی طرح روم اور لاطینی شہروں میں ایک پجاری تھا جو شاہ قربانی یا شاہ رسوم مقدسہ کہلاتا تھا۔ اسی طرح اس کی بیوی کا لقب ملکۂ رسوم مقدسہ تھا۔ Frazer کے مطابق ایتھنز کی جمہوری ریاست میں مجسٹریٹ دوم کو، جو ہر سال بدلتا رہتا تھا، بادشاہ کہا جاتا تھا اور اس کی بیوی کو ملکہ۔ ان دونوں کے فرائض کی نوعیت مذہبی تھی۔ ۱۸؎

بہت سی یونانی جمہوریتوں میں اس قسم کے بادشاہ ہوتے تھے جن کے فرائض مذہبی ہی تھے اور ان فرائض کا محور ریاست کا معبد عام ہوتا تھا۔ اسپارٹا، جو خالص یونانی قسم کی ریاست کا واحد نمونہ تھی، اس میں بادشاہ دیوتاؤں کے اخلاف کی حیثیت سے قربانی کی تمام رسمیں بہ نفس نفیس خود ادا کیا کرتے تھے۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی اور شاہی اقتدار کا یہ امتزاج قطعاً کوئی نئی چیز نہیں۔ دنیا میں بہت سے ایسے ممالک کا ذکر ملتا ہے جہاں مذہبی پیشوا اور حکمران کے فرائض ایک ہی شخص سر انجام دیتا تھا۔ Frazer لکھتا ہے:

> ‘‘Asia Minor, for example, was the seat of various great religious capitals peopled by thousands of sacred slaves, and ruled by pontiffs who wielded at once temporal and spiritual authority, like the popes of mediaeval Rome’’.19
>
> (ایشائے کوچک مختلف عظیم مذاہب کے ان دار الممالک کا مرکز تھا جو ہزارہا مقدس غلاموں کا مسکن تھا اور جن پر ایسے مہا پجاری حکومت کرتے تھے جنہیں ازمنۂ وسطیٰ کے رومی پاپاؤں کی طرح دینی اور دنیوی دونوں قسم کے اختیارات حاصل تھے۔)

مذہبی فرائض اور شاہی اقتدار کا یہ امتزاج سرزمین ایران میں بھی نظر آتا ہے، جہاں مذہبی راہ نما اور حاکم وقت کا کردار ادا کرنے کے لیے ایک ہی فرد ذمہ دار تھا، جو بہ یک وقت اپنی رعایا کی بہبود و رعایت اور ان کی دینی ضرورتوں کی تکمیل کا خیال رکھتا تھا۔ ڈاکٹر کبیر احمد جائسی ’ایرانی فکر کے قدیم ماخذ‘ کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ’’ایرانی مذہب کا بانی و پیشوا مانی [بادشاہ] اگر ایک طرف اپنے آپ کو زردشتی [زرتشتی] مذہب کا سوشیانس موعود ۲۰؎ اور مسیحی مذہب کا فارقلیط ۲۱؎ کہتا تھا تو دوسری طرف بودھ مذہب کا موعود ہونے کا بھی مدعی تھا۔‘‘ ۲۲؎

ازمنۂ قدیم میں جب انسانی معاشرے اپنی ابتدائی حالت سے گزر رہے تھے اس وقت لوگوں کے مذہبی جذبات کا استحصال کرتے ہوئے اقتدار کے سنگھاسن پر براجمان ہونا کوئی اتنا مشکل نہ رہا ہوگا جبھی تو ہر طرف مذہب اور سیاست کا گٹھ جوڑ بہ کثرت نظر آتا ہے۔ شاہی اقتدار اور مذہبی فرائض میں وحدت شاہان چین و مڈغاسکر کی روایات میں بھی شامل رہی ہے۔ ۲۳؎

قدیم ترکی میں بھی صورت حال کچھ مختلف نہ تھی۔ بادشاہ اور اس کی ملکہ انتظامی حیثیت کے ساتھ مذہبی حیثیت کے بھی حامل تھی اور اپنے علاقے اناطولیہ کے دیوتا کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا بھی تھے۔ Sarah مذاہب عالم پر لکھی گئی اپنی کتاب میں رقم طراز ہے:

> "His [King’s] daily schedule-indeed, his whole life was determined by his religious duties. He and queen were the highest priest and priestess of the national deity. 24"
>
> (بادشاہ کی روزمرہ کی مصروفیات زندگی، بلکہ اس کی ساری زندگی کا تعین اس کے مذہبی فرائض اور ان کی نوعیت کرتی تھی۔ بادشاہ اور ملکہ اپنے قومی یا علاقائی دیوتا کے کاہن اعظم بھی ہوتے تھے۔)

اناطولیہ میں شاہی اختیار پر مذہبی فرائض غالب تھے۔ نہ صرف وقت کا بادشاہ اپنی روزمرہ زندگی کے معمولات کی بجا آوری میں مذہبی مصروفیات کو اولیت دینے پر مجبور ہوتا تھا بلکہ ساری زندگی اس کو کس وقت کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے؟ بادشاہ کے اختیار میں نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا تعین شاہ اناطولیہ کی مذہبی ذمہ داریاں اور فرائض کرتے تھے۔ دینی اور دنیوی اختیارات کا یہ امتزاج فقط ایشیا اور یورپ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ Frazer کے بقول یہی روایت مشرقی افریقہ اور وسطی امریکہ میں بھی جاری تھی۔ نئے سال کے بڑے تہوار میں جب سلطنت کی فلاح و بہبود کی غرض سے بیل کی قربانی دی جاتی تو بادشاہ اس موقع پر پوجا پاٹ اور شکرانہ ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوتا تھا۔ روایت کے جھٹ پٹے میں دینی و دنیوی اقتدار اور شاہی و مذہبی فرائض کا ایسا ہی امتزاج وسطی امریکہ کے خطے کے بادشاہوں کے ہاں نظر آتا ہے۔ ۲۵؎ خالق اور مخلوق کے درمیان وسیلہ بننے کا دعویٰ کرنے والے یہ مذہبی پیشوا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ بادشاہ

اورحکم ران اپنی تاج پوشی کے لیے بھی ان کے محتاج ہو گئے تھے۔مذہبی پیشوا صحیح معنوں میں بادشاہ گر بن چکے تھے تھے۔رفتہ رفتہ صورت حال یہاں تک پہنچ گئی کہ مذہبی پیشواہی دیوتا کے اوتار کی حیثیت سے حکومت کرنے لگے۔اسی بابت Florian Ebeling نے لکھا ہے:

> "Horus this ancient Egyptian god was at first worshiped as a sky god later the reigning king was considered to be an incarnation of Horus." 26
>
> (قدیم مصر میں ہورس ۲۷؎ دیوتا کی سب سے پہلے آکاش کے دیوتا کی حیثیت سے پرستش کی گئی۔بعد میں اس وقت کے حکم راں کو ہورس دیوتا کے اوتار کی حیثیت سے قابل تعظیم سمجھا گیا۔)

آسمانی ہدایت سے محروم معاشروں میں مذہبی پیشوائیت اپنے وجود کے لیے بنی نوع انسان کی ان عالم گیر اور آفاقی ضروریات کی رہین منت رہی ہے جو اسے زندگی بسر کرنیا و راپنے وجود کو قائم رکھنیکیلیے فوق البشر ہستی کی معاونت کی صورت میں درکار تھیں۔انسان ہمیشہ سے قربانی اور چڑھاوے کی صورت میں اس ہستی کو راضی کرنے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے جو اس کے خیال میں کائنات پر راج کرتی ہے ، یا پھر جادو منتر کے ذریعے واقعات کے رونما ہونے کو اپنی مرضی اور رضا مندی کے تابع کرنے کے لیے کوشاں رہا ہے۔ان معاملات میں راہ نمائی کی طلب نے پیشہ ورانہ ساحروں اور مذہبی پیشواؤں کے لیے وحشی اور غیر متمدن اقوام میں راستہ ہم وار کر دیا، جہاں تک متمدن اقوام کی بات ہے تو ان کے ہاں بھی اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے مذہبی پیشواؤں کی بالادستی قبول کرنے کے لیے احتیاجات کی ہرگز کمی نہ تھی۔ان حالات میں ایسے افراد کی شدید ضرورت پیدا ہوگئی تھی جن کے بارے میں یہ قیاس کر لینا مناسب تھا کہ ان کے پاس زیادہ علم یا حقیقت اور اصولوں سے واقفیت اور دیگر امور میں دست رس دوسروں سے کہیں زیادہ ہے اور وہ ہر قسم کی فکر اور خوف سے آزاد ہو کر متوقع نتائج حاصل کر سکتے ہیں ایسے افراد مذہبی پیشواؤں اور جادوگروں کی صورت میں سامنے آئے۔

حواشی و مراجع

1. Smolarski, D. C . (1994). Sacred Mysteries: Sacramental Principles and Liturgical Practice, New York: Paulist Press, p-128

۲۔ دہلوی، احمد سید، مرتب: فرہنگ آصفیہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱/ ۵۷۶

۳۔ رضوی، تصدق حسین، سید، مرتب: لغات کشوری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س ن، ص ۸۸

4. Editing Staff (2007). The Chambers Dictionary, Edinburgh: Chambers Harrap Publishers Ltd, 10th Edition, p-1342

۵۔ خیر اللہ، ایف ایس، قاموس الکتاب، لاہور: مسیحی اشاعت خانہ، ۲۰۰۵ء، ص ۷۶۹

6. Editing Staff, The Chambers Dictionary, p-1208

7. Frazer, J. G. (1925) The Golden Bough, New York: The Macmillan Company, p-106

۸۔ مودودی، سید ابوالاعلی، تفہیم القرآن، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۹۵ء، ۱/ ۱۹۸

۹۔ عثمانی، مولانا شبیر احمد، تفسیر عثمانی، کراچی: دار الاشاعت، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۶۲

۱۰۔ دریابادی، مولانا عبدالماجد، تفسیر ماجدی، لاہور: پاک کمپنی، ۲۰۰۷ء، ص ۸۰۶

۱۱۔ حقانی، مولانا عبدالحق، تفسیر فتح المنان، کراچی، میر محمد کتب خانہ مرکز علم و ادب، ۱۳۱۴ھ، ۵/ ۲۲۸

12. Frazer, The Golden Bough, p-10

۱۳۔ مسیحی مکتبہ فکر، جس سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر لاطینی امریکہ اور شرق ایشیا میں مقیم ہیں۔

14. Doctrine and Covenants 84:35

15. Alma13:7

16. Rinpoche, T. T. (2007). Gurus for hire Enlightenment for sale, Bandar Utama: Kechara Media and Publications, p-169

17. Ball, W. (2000). Rome in the East: The Transformation of an Empire, New York: Routledge, p-434

18. Frazer, The Golden Bough, p-9

19. Ibid

۲۰۔ سوشیانس Saoshyant زرتشت مذہب کے مطابق ایسا منجی جو دنیا کو دوبارہ اس کی بہتر حالت میں لوٹائے گا۔

۲۱۔ انجیل یوحنا میں موجود ایک پیش گوئی میں استعمال کیا جانے والا نام، جس کے متعلق مسیحی کہتے ہیں کہ اس سے مراد روح القدس ہے اور مسلمانوں کے نزدیک اس سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے۔

۲۲۔ جائسی، کبیر احمد، ایرانی فکر کے قدیم ماخذ، سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، جلد نمبر ۶، شمارہ نمبر ۱، علی گڑھ: ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، جنوری-مارچ، ۱۹۷۸ء ص ۷۶

23. Frazer, The Golden Bough, p-9

24. Sarah I. J. (2001). Religions of the Ancient World, Cambridge: The Belknap Press of Harvard University Press, p-299

25. Frazer, The Golden Bough, p-10

26. Ebeling F. (2011). The Secret History of Hermes Trismegistus, Ithaca: Cornell University Press, p-147

۲۷۔ قدیم مصری مذہب میں سب سے پرانا اور سب سے اہم دیوتا۔

نظر

بین المذاہب ڈائیلاگ

ڈاکٹر محمد رفعت

مغربی تہذیب تاریخ کے اُس مرحلے سے گزر رہی ہے جہاں اُس کے پاس کوئی ایسا فلسفہ یا نظریہ نہیں رہ گیا ہے جس پر اسے خود اطمینان ہو۔ اس لیے شیطان کے لیے اب یہ تو ممکن نہیں رہا کہ وہ انسانوں کو راہِ حق سے روکنے کے لیے مغربی تہذیب کے نظریات اور فلسفوں کو مؤثر طور پر استعمال کر سکے، البتہ وہ وقتاً فوقتاً بعض نعرے اور دل فریب اصطلاحات سامنے لاتا رہتا ہے، جن کے ذریعے وقتی طور پر ہی سہی، انسانوں کو راہِ حق سے روکا جاسکتا ہے، یا اُن کے ذہنوں میں انتشار (Confusion) پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ان دل فریب نعروں میں سے ایک Inter-faith Dialogue (بین المذاہب ڈائیلاگ) کا نعرہ ہے۔ بہت سے مسلمان بھی اس کی تائید میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور اس کے مضمرات کا تجزیہ کرنے میں انھوں نے تساہل اور سطح بینی سے کام لیا ہے۔

ڈائیلاگ کا مفہوم

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ 'ڈائیلاگ' کے معنیٰ صرف 'بات چیت' یا 'گفتگو' کے ہوتے ہیں (اس لیے اردو میں 'ڈائیلاگ' کا ترجمہ 'مکالمہ' بھی کیا جاتا ہے) لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ڈائیلاگ کے اصل معنیٰ 'دو مختلف نقطہ ہائے نظر کے درمیان مفاہمت کے لیے کی جانی والی 'گفتگو' کے ہیں (اور محض 'گفتگو' کے نہیں ہیں)۔ ڈائیلاگ کا مقصود 'سمجھوتہ' یا 'معاہدہ' ہوتا ہے، جب کہ 'گفتگو' عام لفظ ہے۔ اور اس کا مقصود 'دعوت' بھی ہوسکتا ہے، معلومات بہم پہنچانا بھی اور 'سمجھوتہ' بھی۔

Cambridge International Dictionary میں Dialogue کے تحت لکھا گیا ہے:

"Formal talks between opposing countries, political groups, etc. who have perviously not had good relationships." (2002 Edition)

''دو ایسے مخالف ممالک یا سیاسی دھڑوں کے درمیان باضابطہ گفتگو، جن کے درمیان تعلقات خوش گوار نہ رہے ہوں۔''

New Shorter Oxford English Dictionary میں Dialogue کے تحت ہیں:

"Diplomatc contact between representatives of two nations or blocks." (1993 Edition)

''دو قوموں یا بلاکوں کے نمائندوں کے درمیانی سفارتی رابطہ۔''

ڈائیلاگ یا دعوت؟

قرآن مجید انسانوں سے خطاب کو اسالیب اختیار کرتا ہے، اُن میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے 'ڈائیلاگ' کے ہم معنیٰ سمجھا جاسکتا ہو، یعنی جہاں انسانوں میں مختلف نقطہ ہائے نظر اور ادیان کے حامل گروہوں سے یہ کہا گیا ہو کہ راہِ حق کا تعین کرنے کے لیے 'وہ باہم مذاکرات کے ذریعے کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔' اس کے برخلاف قرآن مجید تو یہ کہتا ہے کہ اللہ نے حق یا 'سیدھا راستہ' بالکل واضح کر دیا ہے اور انسانوں کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ اس کو اختیار کریں:

لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ
فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ

اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (البقرة: ٢٥٦)

''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے ممیز کردی گئی ہے۔ اب جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔''

دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں بنیادی ہدایت سورہ نحل میں ملتی ہے:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ٥ (النحل: ١٢٥)

''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور ان سے مباحثہ کرو اس طریقہ سے جو بہترین ہو۔ بلاشبہ تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کون راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہے اور کون سے لوگ ہدایت یاب ہیں۔''

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اوپر کی آیتوں میں مخاطبین کو آگاہ کرنا تھا کہ یہ پیغمبر اصل ملتِ ابراہیمؑ کو لے کر آلے ہیں۔ اگر کامیابی چاہتے ہو اور 'حنیف' ہونے کے دعوے میں سچے ہو تو اس راستے پر چل پڑو۔''

ادع الی سبیل ربك سے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تعلیم دی جارہی ہے کہ لوگوں کو راستے پر کس طرح لانا چاہیے؟ اس کے تین طریقے بتلائے: حکمت، موعظتِ حسنہ اور جدالِ احسن۔

'حکمت' سے مراد یہ ہے کہ نہایت پختہ اور اٹل مضامین مضبوط دلائل وبراہین کی روشنی میں حکیمانہ انداز میں پیش کیے جائیں، جن کو سن کر فہم و ادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا سکے۔ دنیا کے خیالی فلسفے اُن کے سامنے ماند پڑ جائیں اور کسی قسم کی علمی و دماغی ترقیات وحیِ الٰہی کے بیان کردہ حقائق کا ایک شوشہ تبدیل نہ کرسکیں۔

'موعظتِ حسنہ' مؤثر اور رقت انگیز نصیحتوں سے عبارت ہے، جن میں نرم خوئی اور دل سوزی کی روح بھری ہو۔ اخلاص، ہمدردی اور شفقت و حسنِ اخلاق سے خوبصورت اور معتدل پیرائے میں جو نصیحت کی جاتی ہے، بسااوقات پتھر کے دل بھی (اسے سن کر) موم ہو جاتے ہیں، مردوں میں جانیں پڑ جاتی ہیں، ایک مایوس و پژمردہ قوم جھرجھری لے کر کھڑی ہو جاتی ہے اور لوگ ترغیب و ترہیب کے مضامین سن کر منزلِ مقصود کی طرف بے تابانہ دوڑنے لگتے ہیں۔ اور بالخصوص جو زیادہ عالی دماغ اور ذکی وفہیم نہیں ہوتے، مگر طلب حق کی چنگاری سینے میں رکھتے ہیں، ان میں مؤثر وعظ و پند سے عمل کی ایسی اسٹیم بھری جاسکتی ہے، جو بڑی اونچی عالمانہ تحقیقات کے ذریعے سے ممکن نہیں۔'' (تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

مباحثہ

'ڈائیلاگ' اور مباحثہ میں فرق یہ ہے کہ 'ڈائیلاگ' میں 'کسر وانکسار' کے ذریعے دو مختلف نقطہ ہائے نظر میں کچھ 'لچک' پیدا کی جاتی ہے، تاکہ اُن کے درمیان سمجھوتہ ہوسکے۔ اس کے برعکس 'مباحثے' میں ہر فریق اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہتا ہے اور اس کی تائید میں اپنے دلائل پیش کرتا ہے۔ قرآن مجید نے 'ڈائیلاگ' کے بجائے 'مباحثہ' کی اجازت دی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جب مخاطب 'حکمت' اور 'موعظت حسنہ' کے باوجود 'قبولِ حق' کی جانب مائل نہ ہو۔ البتہ یہ مباحثہ بہترین انداز میں ہونا چاہیے۔ اس بہترین انداز کو 'جدالِ احسن' کہا گیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مزید فرماتے ہیں:

''دنیا میں ہمیشہ سے ایک ایسی جماعت بھی موجود رہی ہے جس کا کام ہر چیز میں الجھنا اور بات بات میں حجتیں نکالنا اور کج بحثی کرنا ہے۔ یہ لوگ نہ حکمت کی باتیں قبول کرتے ہیں نہ وعظ ونصیحت سنتے ہیں، بلکہ چاہتے ہیں کہ ہر مسئلے میں بحث ومناظرہ کا بازار گرم ہو۔ بعض اوقات اہلِ فہم وانصاف اور طالبینِ حق کو بھی شبہات گھیر لیتے ہیں اور بدونِ بحث کے تسلی نہیں ہوتی۔ اس لیے فرمادیا کہ اگر ایسا موقع پیش آئے تو بہترین طریقے سے تہذیب، شائستگی، حق شناسی اور اور انصاف کے ساتھ بحث کرو۔ اپنے حریفِ مقابل کو الزام دو تو بہترین اسلوب سے دو۔ خواہی نخواہی دل آزار اور جگر خراش باتیں مت کرو، جن سے قضیہ بڑھے اور معاملہ طول کھینچے۔ مقصود تفہیم اور احقاقِ حق ہونا چاہیے، خشونت، بداخلاقی سخن پروری اور ہٹ دھرمی سے کچھ نتیجہ نہیں۔

طریقِ دعوت وتبلیغ میں تم کو خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا چاہیے۔ اس فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ کس نے مانا، کس نے نہیں مانا۔ نتیجہ کو خدا کے سپرد کرو۔ وہ ہی راہ پر آنے والوں اور نہ آنے والوں کے حالات کو بہتر جانتا ہے۔ جیسا مناسب ہوگا، اُن سے معاملے کرے گا۔'' (تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

ان تشریحات سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کا منشا یہ ہے کہ اہلِ ایمان تمام انسانوں کو 'اللہ کے راستے' کی طرف بلائیں اور اس فریضے کی انجام دہی میں 'حکمت' اور 'موعظتِ حسنہ' سے کام لیں۔ ضرورت پڑنے پر احسن انداز میں مباحثہ کرنے کی بھی اجازت ہے۔ لیکن قرآن مجید نے کہیں بھی اہلِ

ایمان سے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ گم راہی میں پڑے ہوئے افراد کے ساتھ 'ڈائیلاگ' کریں اور حق اور باطل کے درمیان کسی 'سمجھوتے' پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

دین کا موضوع

اس ضمن میں اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ دین کا موضوع کیا ہے؟ بہ الفاظِ دیگر دین یا مذہب کن سوالات سے بحث کرتا ہے؟ دین کے موضوع کے تین بنیادی پہلو ہیں:

(الف) تصورِ کائنات اور تصورِ انسان

(ب) انسان کی فلاح اور نجات کا راستہ

(ج) قانونِ الٰہی یا شریعت

دین یہ بتاتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے؟ کیسے وجود میں آئی، اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کی تخلیق سے خالق کا منشا کیا ہے؟ کائنات کی موجودات کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے؟ اور ان سب کا اپنے خالق سے کیا تعلق ہے؟

دین کے 'موضوع' کا ایک اہم جز خود 'انسان' ہے۔ انسان کی پوزیشن کائنات میں کیا ہے؟ اس کا دوسری مخلوقات سے کیا تعلق ہے؟ موت کے بعد انسان کو کن حالات سے سابقہ پیش آئے گا؟ انسان آزاد ہے یا مجبور؟ اور وہ ذمہ دار اور جواب دہ ہے یا جواب دہی سے بے نیاز ہے؟

اِسی طرح دین اس اہم سوال سے بحث کرتا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کیا ہے؟ وہ قدریں کیا ہیں جن کو اسے زندگی کی بنیاد بنانا چاہیے؟ اخلاقی اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے؟ فرد کس طرح اخلاقی و روحانی ترقی کر سکتا ہے اور اپنی کمزوریوں پر قابو پا سکتا ہے؟ خالق کی رضا و قرب کے حصول کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے؟ پھر دین کا موضوع یہ بھی ہے کہ انسانوں کے لیے اور انسانی معاشرے کے لیے الٰہی ہدایات کیا ہیں؟ خالقِ کائنات نے کن کاموں اور چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے اور کن کو حلال؟ اس کے قوانین اور ضوابط کیا ہیں؟ وہ حدود کون سی ہیں جن کے اندر انسانوں کو کام کرنا چاہیے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن سے دین اور مذہب بحث کرتا ہے۔ اب کیا ان سوالات میں کسی کا جواب بھی اس طریقے سے دیا جا سکتا ہے کہ پہلے انسانوں کے مختلف گروہ قیاس آرائیاں کر کے اور گمان کے تکّے لڑا کر کچھ 'جوابات' تجویز کر لیں اور پھر آپس میں 'ڈائیلاگ' کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں؟

یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ ان بنیادی سوالات کی نوعیت تو یہ چاہتی ہے کہ خود خالقِ کائنات کی طرف سے اِن کا جواب ملے اور صاف، واضح اور متعین صورت میں ملے۔ قرآن کا موقف اس سلسلے میں یہی ہے۔

خالقِ کائنات اپنے بندوں کو یقین دلاتا ہے کہ:

إن علینا للھدیٰ (اللیل: ۱۲)

''بے شک ہدایت دینا ہمارے ذمہ ہے۔''

دین کے 'موضوع' کا ایک اہم جز خود 'انسان' ہے۔ انسان کی پوزیشن کائنات میں کیا ہے؟ اس کا دوسری مخلوقات سے کیا تعلق ہے؟ موت کے بعد انسان کو کن حالات سے سابقہ پیش آئے گا؟ انسان آزاد ہے یا مجبور؟ اور وہ ذمہ دار اور جواب دہ ہے یا جواب دہی سے بے نیاز ہے؟

حاملینِ کتاب کی ذمہ داری

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے۔ اُس نے اُن کو اس امتحان میں نہیں ڈالا ہے کہ وہ بہ طورِ خود 'حقیقت' کی تلاش کریں اور اگر یہ تلاش مختلف گروہوں کو مختلف نتائج تک پہنچا دے تو پھر آپس میں 'ڈائیلاگ' کریں۔ اس کے برخلاف اس نے راہِ راست اپنی کتاب نازل کر کے واضح کر دی ہے اور انسانوں کو دعوت دی ہے کہ اس کتاب پر ایمان لائیں اور اس کی پیروی کریں۔ چنانچہ حاملینِ کتاب (امتِ مسلمہ) کا کام صرف یہ ہے کہ وہ سارے انسانوں کو کتابِ الٰہی کی طرف بلائیں اور خود اس کتاب کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو استوار کریں:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً (البقرۃ: ۱۴۳)

''اس طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔''

اہلِ ایمان کو چاہیے کہ اللہ کی طرف بلانے کا کام اس مستعدی کے ساتھ کریں کہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کے لیے اللہ کی پکار کو سننا ممکن ہو سکے اور وہ یہ کہہ سکے:

رَّبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِياً يُنَادِي لِلإِيمَانِ أَنْ آمِنُواْ بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الأبْرَارِ ٥

(آل عمران: ۱۹۳)

”اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انھیں دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔“

کلمہ سواء:

قرآن مجید میں اہلِ کتاب سے کہا گیا ہے کہ وہ ’کلمہ سواء‘ (مشترک بات) کی طرف آئیں۔ اس کو بعض لوگوں نے ’ڈائیلاگ‘ کے مماثل سمجھا ہے۔ اس لیے قرآنِ مجید کی روشنی میں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ’کلمہ سواء‘ کیا ہے؟ متعلقہ آیت یہ ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ٥ (آل عمران: ٦٤)

”کہو: اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ’ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔‘ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ ہم تو مسلم ہیں۔ (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے ہیں۔“

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یعنی ایک ایسے عقیدے پر اتفاق کرلو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جس کے صحیح ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تمہارے اپنے انبیاء سے یہی عقیدہ منقول ہے۔ تمہاری اپنی کتبِ مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔“ (سورہ آل عمران، تفہیم القرآن، جلد ا، حاشیہ ۵۷)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

”حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب وفد نجران سے کہا اسلموا (مسلم بن جاؤ) تو کہنے لگے اسلمنا (ہم مسلم ہیں)۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی طرح ان کو بھی مسلم ہونے کا دعویٰ تھا۔ اسی طرح جب یہود و نصاریٰ کے سامنے توحید پیش کی جاتی تو کہتے کہ ہم بھی خدا کو ایک کہتے ہیں (بلکہ ہر مذہب والا - کسی نہ کسی رنگ میں - اوپر جا کر اقرار کرتا ہے کہ بڑا خدا ایک ہی ہے) یہاں اسی طرح توجہ دلائی گئی کہ بنیادی عقیدہ (خدا کا ایک ہونا اور اپنے کو مسلم ماننا) جس پر ہم دونوں متفق ہیں، ایسی چیز ہے جو ہم سب کو ایک کرسکتا ہے، بہ شرطے کہ آگے چل کر اپنے تصرف اور تحریف سے اس کی حقیقت کو نہ بدل ڈالیں۔

ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح زبان سے (خودکو) مسلم و موحد کہتے ہو، حقیقتاً و عملاً بھی اپنے کو تنہا خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سپرد کردو۔ نہ اس کے سوا کسی کی بندگی کرو، نہ اس کی صفاتِ خاصہ میں کسی کو شریک ٹھہراؤ، نہ کسی اور عالم فقیر، پیر، پیغمبر کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو صرف رب قدیر کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ مثلاً کسی کو اس کا بیٹا پوتا بنانا، یا نصوصِ شریعت سے قطعِ نظر کرکے محض کسی کے حلال و حرام کردینے پر - اشیاء کی حلت و حرمت کا مدار رکھنا - یہ سب امور دعوائے اسلام و توحید کے منافی ہیں۔“ (تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

مفسرین کی ان تشریحات سے معلوم ہوا کہ ’کلمہ سواء‘ کا منشا یہ نہ تھا کہ جن گم راہیوں میں اہلِ کتاب مبتلا تھے ان میں اور اسلام کے پیش کردہ اصولوں میں - کوئی بیچ کی راہ اختیار کرکے - سمجھوتہ کرادیا جائے، بلکہ منشا یہ تھا کہ اہلِ کتاب کو اس ’تناقض‘ (Inconsistenccy) کی طرف توجہ دلائی جائے جس میں وہ مبتلا تھے۔ ایک طرف تو وہ توحید کے ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، مگر دوسری جانب انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا تھا اور اپنے ’احبار و رہبان‘ کو حلال و حرام کے اختیارات دے رکھے تھے (جب کہ قانون سازی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حق ہے)۔ ’کلمہ سواء‘ کا تذکرہ کرکے اہلِ کتاب سے کہا گیا کہ ’جس توحید کو ماننے کا تم دعویٰ کرتے ہو، اس کے منافی جو باتیں تمہارے عقیدے اور عمل میں موجود ہیں، ان سے باز آجاؤ۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اللہ کے فضل سے ہم مسلمانوں کا عقیدہ و عمل اس تناقض سے پاک ہے۔ ہمارے عقیدے میں کوئی ایسی آمیزش نہیں ہوئی ہے، جو توحید کے خلاف ہو اور اپنے عمل کو ہم نے ہر شرک سے پاک رکھا ہے۔

مغربی اصطلاحات سے اجتناب

Interfaith Dialogue ایک فتنہ انگیز اصطلاح ہے، جو مسلمانوں کے ذہن کو ’دعوت‘ کے بجائے غیر مسلموں کے ساتھ ایک ’کارِ عبث‘ میں شرکت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اکثر مغربی اصطلاحوں کا معاملہ یہی ہے کہ وہ حالات کے درست تجزیے میں معاون ہونے کے بجائے ’انتشارِ فکر‘ پیدا کرنے کا کام کرتی ہیں۔ امتِ مسلمہ کے لیے موزوں یہی ہے کہ وہ مغربی اصطلاحات سے اجتناب کرے اور تحقیق اور تجزیے کے لیے خود ایسی اصطلاحات دریافت اور تجویز کرے جو حقائق کی درست عکاسی کرتی ہوں۔

سکھ مت
ایک مطالعہ

محمد علی شاہ شعیب

ہمارا ملکِ عزیز ہندوستان ایک ایسی سرزمین ہے جہاں مختلف نظریات اور مذاہب کے ماننے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اس سرزمین پر بہت سے مذاہب تو وہ ہیں جو باہر سے آئے، لیکن کئی مذاہب ایسے بھی ہیں جو اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ ان مذاہب میں سے ایک سکھ مذہب بھی ہے۔ اس مذہب کی شروعات عظیم مصلح اور سنت شاعر گرونانک سے مانی جاتی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ پنجاب کی سیاسی صورتِ حال قابلِ رحم تھی۔ خود گرونانک کے الفاظ میں ”بادشاہ قصاب بن گئے تھے، ظلم ان کی چھری تھی، احساسِ ذمہ داری نے پر تول رکھے تھے اور ناپید ہو چکا تھا اور سچائی کا چاند کہیں نظر نہیں آتا تھا۔“

ان حالات میں لوگوں کو صحیح راہ دکھانے، ان کے اندر مذہبی تفریق کو ختم کرنے اور ان کے اندر انسانیت کا جوہر پیدا کرنے کے لیے گرونانک جی نے ایک نیا طریقہ استعمال کیا جو آگے چل کر باقاعدہ مذہب کی شکل اختیار کر گیا۔ چونکہ پنجاب میں مسلمان ایک عرصے سے رہتے بستے چلے آرہے تھے، جن کا عقیدہ توحید ہے، اس لیے اس نئے مذہب پر اس کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ بہت سے دیوی دیوتاؤں کی بہ نسبت ایک قادرِ مطلق اللہ کی عبادت کو اہمیت دینا، تمام انسانوں کو ایک سمجھنا اور ان کے درمیان کوئی تفریق نہ کرنا اور رہبانیت کو رد کرنا اس بات کی واضح علامات ہیں کہ سکھ مذہب پر اسلام کے اثرات ہیں۔

دنیا کے تقریباً سبھی رہنما و بانیانِ مذاہب کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا مرکزی واقعہ ضرور پیش آیا ہے جس نے ان کی زندگی کے دھارے کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ گرونانک کی زندگی میں بھی رونما ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن صبح کو جب گرونانک اپنے معمول کے مطابق بین ندی میں نہانے کے لیے اترے تو وہ غوطہ لگانے کے بعد باہر نہیں نکلے۔ ان کے کپڑے ندی کے کنارے پائے گئے اور تمام لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ندی میں ڈوب گئے ہیں۔ نواب دولت خاں (جو گرونانک جی کو بہت عزیز رکھتا تھا) نے غوطہ خوروں اور جال ڈالنے والوں کے ذریعہ انتہائی کوشش کی کہ نعش ہی دستیاب ہو جائے مگر گرونانک جی کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ندی میں غائب ہونے کے تین دن بعد گرونانک جی دوبارہ ظاہر ہوئے۔ لوگوں کی انتہائی حیرت اور استفسارات کا جواب انھوں نے مکمل خاموشی سے دیا اور اگلے روز جب انھوں نے زبان کھولی تو سب سے پہلے جو الفاظ ان کی زبان پر جاری

ہوئے وہ یہ تھے کہ ’’نہ کوئی ہندو ہے اور نہ ہی مسلمان۔ پھر میں کس کا راستہ اختیار کروں۔ میں خدا کے راستے پر چلوں گا۔ خدا نہ تو ہندو ہے نہ اور نہ مسلمان اور جو راستہ میں اپناتا ہوں وہی راستہ خدا کا ہے، وہ قادرِ مطلق 'سب کا رب' ہر جگہ موجود، وقت کی قید سے آزاد، ہمیشہ رہنے والا اور یکا و تنہا ہے اور گرو کرپا (مہربانی) سے اسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔‘‘

سکھ روایات کے مطابق گرو نانک اس دوران خدا کے حضور میں تھے، جہاں انھیں براہِ راست خدا تعالیٰ کی طرف سے عشقِ الٰہی کا جام عطا ہوا اور ذکرِ الٰہی کی اشاعت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد گرو نانک جی کی زندگی میں ایک بنیادی انقلاب آ گیا اور وہ یادِ الٰہی میں ہمہ تن مشغول اور ذکرِ الٰہی کو عام کرنے میں مصروف ہو گئے۔

عقائد:

سکھ مت کا بنیادی عقیدہ انتقام اور کینہ پروری کے بجائے رحم دلی اور امن کا پیغام عام کرنا ہے۔ بابا گرو نانک جی کی تعلیمات سکھ صحیفے گرو گرنتھ صاحب میں موجود ہیں، جو گرمکھی میں لکھے گئے اشعار کا مجموعہ ہے۔ بابا گرو نانک نے تاکید کی کہ تمام انسان بغیر کسی رسم اور مذہبی پیشواؤں کے اپنے خدا تک براہِ راست رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

کرم (کام)، اسمرن (ذکر)، گیان (علم) اور مکتی (نجات) کو سکھ مذہب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مذہب کے مطابق گرو کے وسیلے سے ہی نجات ممکن ہے۔ اس لیے گروؤں کے عہد ناموں کو فرائض میں شامل کیا گیا ہے۔ سنیاس کو سکھ مت میں کوئی مقام حاصل نہیں۔ ہر سکھ کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کے دفاع کے لیے اور سماجی ناانصافیوں، چھوت چھات کے خلاف جنگ کرے اور بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا کی عبادت کرے۔ اس مذہب میں پیغمبری کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتا ہے۔

مول منتر (بنیادی کلمہ):

کہا جاتا ہے کہ گرو نانک جی کو سلطانپور میں جو مرکزی روحانی تجربہ حاصل ہوا تھا اس کا سب سے پہلا شعری اظہار مول منتر (بنیادی کلمہ) کی شکل میں ہوا۔ اس میں گرو نانک جی کا ذاتِ خداوندی کا تصور نہایت ایجاز کے ساتھ، لیکن انتہائی جامع شکل میں آ گیا ہے۔ ان کا مول منتر ہے: 'ایک اونکار' یعنی خدا ایک ہے۔ 'ست نام' یعنی اس کا نام سچ ہے۔ 'کرتا پرکھ' یعنی وہی فاعلِ مطلق ہے۔ 'نربھو' یعنی وہ بے خوف ہے۔ 'نرویر' یعنی کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ 'اکال مورتی' یعنی وہ ازلی اور ابدی ہے۔ 'اجونی' یعنی اس کی کوئی شکل یا صورت نہیں ہے۔ 'سبھ بھن' یعنی وہ قائم بالذات ہے۔ 'گر پرسادی' یعنی وہ خود اپنی توفیق و رضا سے حاصل ہوتا ہے۔

بنیادی اصول:

سکھ مذہب کا بنیادی اصول ہے: 'نام جپو، کرت کرو اور ونڈ چکھو' یعنی ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتے رہو، زندگی میں محنت سے کام کرو اور اپنی کمائی کا ایک حصہ غریبوں اور ضرورت مند لوگوں کو خیرات کرو۔ گرو نانک جی محنت کی کمائی اور اس میں سے کی گئی خیرات کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ 'جو شخص محنت کر کے کھاتا اور اپنی نیک کمائی کا کچھ حصہ دوسروں کی مدد کے لیے نکالتا ہے وہ خدا کی معرفت کی راہ پا لیتا ہے۔'

سکھ کون ہے؟

گرو گووند سنگھ کے مطابق ہر وہ مرد یا عورت سکھ ہے جو ایک غیر فانی ذات، گرو گرنتھ صاحب، دس گروؤں اور ان کی تعلیمات و ملفوظات پر ایمان رکھتا ہو، نیز دوسرے کسی بھی مذہب کو نہ مانتا ہو۔ سکھ کی خاص پہچان پانچ ککار (کیش، کنگھا، کچھا، کڑا اور کرپان) سے ہے۔ گرو گووند سنگھ نے ان پانچ ککاروں کو بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ پانچ ککار اس طرح ہیں:

(۱) **کیش:** کیش خدا کی دین اور گرو کی نشانی ہے۔ اس لیے ہر سکھ کے لیے کیش کاٹنا، کٹانا یا کترنا حرام ہے۔ یہ خدا کے آگے سپر ڈال دینے کی علامت ہے۔ جس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ سکھ کو خدا کی مرضی کا ہی اتباع کرنا چاہیے۔ ۱۶۹۹ء میں گرو گووند سنگھ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ: میرا سکھ استرے کا استعمال نہیں کرے گا۔ اس کے لیے استرے کا استعمال کرنا زنا کے مترادف گناہ ہوگا۔ خالصہ کے لیے ایسے نشان ہونے چاہئیں جس سے کہ وہ خالص دکھائی دیں۔

(۲) **کنگھا:** اس کے بارے میں کہا کہ یہ بالوں کی روزانہ صفائی کے لیے خاص کیا گیا ہے۔

(۳) **کچھا:** یہ ستر عورت ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اپنی جنسی خواہشات پر کنٹرول ہونا چاہیے۔

(۴) **کڑا:** چوتھا ککار کڑا ہے، یہ ہمیشہ دائیں ہاتھ میں پہنا جاتا ہے۔ سکھ مت کا ماننا ہے کہ چونکہ ہم سبھی کام دائیں ہاتھ ہی سے کرتے ہیں، اس لیے دائیں ہاتھ میں پہنا ہوا کڑا سکھ کو ہمیشہ اچھے کام کرنے کی ترغیب اور برے کاموں سے پرہیز کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ کڑے کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس سے سکھ اپنی حفاظت کا کام بھی لے سکتا ہے۔

(۵) **کرپان:** یہ اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ کمزوروں اور مظلوموں کی ظلم سے حفاظت کے لیے ہے۔

خالصہ:

سکھ مت کے دسویں اور آخری گرو گووند سنگھ نے اپنے پیروؤں میں سے پانچ کو منتخب کر کے پنج پیارے بنایا۔ پانچویں نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور ایک ہی برتن میں پانی پیا۔ اس سے انھوں نے خالصہ کی شکل میں ایک نئی قسم کی اخوت کی بنیاد رکھی۔ یہ تصور ہندو مت سے یکسر مختلف اسلام کے انسانی بھائی چارے کے تصور سے بالکل قریب ہے۔ ہر خالصہ بیک وقت ایک سنت، ایک سپاہی اور ایک عالم ہوتا ہے۔ چنانچہ سکھ سماج ایک ایسا سماج ہے، جو اپنی روح میں منفرد اپنے کردار میں سنتوں جیسا، باعلم و دانشور ہوتا ہے، خود گرو گووند سنگھ نے خالصہ کی تشریح ان الفاظ میں کی کہ جو ہمیشہ بیدار نور کو دن رات یاد کرتا ہے۔ جس کے ذہن میں اس ایک واحد کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہوتا، جو صاحب ایمان اور محبت سے لبریز ہے، جو ورتوں، قبروں، مندروں پر قطعاً یقین نہیں رکھتا، جو اس خدائے واحد کے سوا کسی کو تسلیم نہیں کرتا۔

سکھ مت کا ادب:

سکھ مذہب ایک ایسا مذہب ہے جس کی تکمیل ۲۰۰ سالوں پر محیط ہے، یعنی گرو نانک جی (جنھوں نے کسی نئے مذہب کی کوئی باقاعدہ اور سنجیدہ کوشش نہیں کی تھی) سے اس کی تعلیمات کا آغاز ہوتا ہے اور مختلف گروؤں نے اس میں اپنے خیالات کی آمیزش کی ہے۔ حالانکہ سکھ مذہب کے بانی گرو نانک ہیں لیکن اس مذہب کی ترتیب و تکمیل میں پانچویں گرو ارجن دیو اور دسویں اور آخری گرو گرو گووند سنگھ کا خاص رول رہا ہے۔

پانچویں گرو گرو ارجن دیو نے ۱۶۰۴ء میں گرو گرنتھ صاحب کی تدوین کی۔ اس میں انھوں نے اپنے سے پہلے چاروں گروؤں کے کلام کو شامل کیا اور خود اپنے کلام کو بھی اس کتاب کا حصہ بنایا، بتایا جاتا ہے کہ اس گرنتھ میں خود ارجن دیو کے ہی ایک تہائی اشعار شامل ہیں۔ موجودہ گرو گرنتھ صاحب میں ۱۳۳ ابواب اور ۵۸۹۴ اشعار ہیں گرو ارجن دیو کا تیار کیا ہوا مجموعہ ہی آج کل مقدس مجموعہ سمجھا جاتا ہے اور اسی سے درس اور اپدیش کا کام لیا جاتا ہے۔

اپنی وفات کے وقت گرو گووند سنگھ نے اپنے متبعین کو یہ نصیحت کی تھی کہ ان کے بعد گروؤں کا سلسلہ ختم ہونے والا ہے اور اب آدی گرنتھ صاحب کو ہی اپنا گرو سمجھو۔ اسی وقت سے آدی گرنتھ کا نام ''گرو گرنتھ صاحب'' پڑ گیا اور سکھوں کے لیے یہ کتاب نہ صرف مقدس قرار دی گئی بلکہ اس کا احترام سکھ مت کے ایمانیات میں شامل ہو گیا۔

گرو گرنتھ صاحب کو ۱۶۰۴ ہی میں گولڈ ٹیمپل میں رکھ دیا گیا اور بھائی بودھ کو اس کا پہلا گرنتھی مقرر کیا گیا تھا۔ اس گرنتھ کو رات سے قبل گولڈن ٹیمپل سے لے جا کر اکال تخت کے ایک کمرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اکال تخت اس مندر کے مقابل ایک عمارت کا نام ہے جس کی بنیاد گرو گووند سنگھ نے رکھی تھی اور یہیں ان کی تخت نشینی بھی ہوئی تھی۔ اکال تخت میں دنیاوی معاملات اور مقدمات کے فیصلے ہوتے ہیں اور گولڈن ٹیمپل میں روحانی فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی سکھوں کے نام تمام حکم نامے یہیں سے جاری کیے جاتے ہیں۔

سکھ مت کا نظریہ زندگی بعدِ موت:

خدا سے متعلق سکھ مت کا عقیدہ اسلام سے قریب ہے اسی بنیاد پر لوگوں کا یہ رجحان بنا کہ گرو نانک مسلمان تھے، لیکن جب ہم ان کے نظریہ زندگی بعدِ موت کے نظریہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرم اور آواگمن کے عقیدے کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں جب تک انسان عشقِ الٰہی میں کمال حاصل کر کے خدا کو نہیں پالیتا وہ بار بار اسی دنیا میں مختلف شکلوں میں جنم لیتا رہے گا۔ بے شمار زندگیوں کے بعد ایک ایسا نادر موقع آتا ہے کہ جب کوئی روح انسانی قالب میں رونما ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ صرف انسان کے قالب میں پیدا ہو کر ہی ممکن ہے کہ وہ خدا کی خوشنودی حاصل کر لے۔ اگر کسی نے یہ نادر موقع کھو دیا تو پھر ۸۴ لاکھ یونیوں سے گزر کر ہی وہ موقع نصیب ہوگا۔ جب تک انسان خدا کی بندگی میں مستغرق ہو کر نجات نہیں حاصل کر لیتا، نہ صرف یہ کہ وہ اسی دنیا میں چکر لگاتا رہے گا بلکہ خدا سے دوری کی وجہ سے مکمل مسرت سے بھی محروم رہے گا۔

نظر

غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت کے حدود

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

موجودہ دور میں 'کثیر مذہبی معاشرہ' (Plural society) کی اصطلاح بہت ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس کا مطلب ہے ایک ایسا سماج جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے بستے ہوں، سب اپنے اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوں، ساتھ میں دیگر مذاہب کا احترام بھی کرتے ہوں، ان کے درمیان خوش گوار سماجی تعلقات ہوں اور وہ پرامن زندگی گزارتے ہوں۔ ایسے سماج کو مثالی (Ideal) سماج تصور کیا جاتا ہے۔

اسلام پر آج کل جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کثیر مذہبی معاشرہ کا قائل نہیں ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ گھل مل کر رہنے سے روکتا ہے اور انھیں الگ تھلگ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ علی الاعلان خود کو حق اور دیگر مذاہب کو باطل قرار دیتا ہے اور اس کے نزدیک حق و باطل میں یک جائی ممکن نہیں۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اسلامی ریاست کی حدود میں انھیں بس ذلت وخواری کے ساتھ رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ انفرادیت، علیٰحدگی اور عزلت پسندی پر مبنی اسلامی تعلیمات کی بنا پر دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ مسلمانوں کے خوش گوار تعلقات اور بقائے باہم ممکن نہیں۔ اسلام پر اعتراضات کرنے والوں کی جانب سے اس طرح کی باتیں آئے دن سننے کو ملتی ہیں۔

غیر مسلموں سے سماجی تعلقات

مذکورہ بالا اعتراضات اسلامی تعلیمات کو صحیح تناظر میں نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں۔ اسلام مذاہب کے اختلاف کو گوارا کرتا ہے اور ایک ایسے سماج کو تسلیم کرتا ہے جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلاَ يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ(هود:١١٨)

''بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا، مگر وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے''۔

اس آیت میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین حق ایک ہی ہے اور اس کی رضا اسی میں ہے کہ لوگ اسے قبول کرلیں، لیکن اس کی مشیت یہ نہیں ہے کہ تمام انسان دینِ حق کے حامل بن جائیں۔ اس نے انھیں انتخاب و اختیار کی آزادی بخشی ہے۔ وہ اپنے لیے جس راہ کو چاہیں پسند کریں اور جس مذہب پر چاہیں عمل کریں۔

سماج میں جو انسان رہتے بستے ہوں ان کے درمیان آپسی تعلقات پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ یہ تعلقات عدل و انصاف اور حسن سلوک کی بنیاد پر قائم ہونے چاہییں اور مذاہب کے اختلاف کو اس معاملے میں آڑے نہیں آنے دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ(الممتحنة:۸)

''اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

غیر مسلموں سے سماجی تعلقات کے سلسلے میں یہ آیت بہت اہم ہے۔ اس میں ان غیر مسلموں کا تذکرہ ہے جو مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہیں رہتے، بلکہ امن و سکون کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارتے ہیں۔ اس میں دو الفاظ قابل مطالعہ ہیں: ''أن تبَرُّ وہُم'' اور ''تُقْسِطُوا إِلَیْہِم''۔ 'بِرّ' سے مراد حسن سلوک اور صلہ رحمی ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ [1] قسط کو بعض مفسرین نے عدل و انصاف کے معنیٰ میں لیا ہے، یعنی غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرو۔ اور اس کا مطلب وہ یہ بتاتے ہیں کہ غیر مسلموں سے تعلقات میں میانہ روی اختیار کرو۔ نہ ان سے بہت قربت رکھو، نہ ان سے بہت دور رہو۔ [2] ابن العربی مالکیؒ کہتے ہیں: ''تُقْسِطُوا إِلَیْہِم کا مطلب یہ ہے کہ صلہ رحمی کے طور پر اپنے مال کا کچھ حصہ انھیں دو۔'' [3]

قرآن کی ان تعلیمات کو مسلمانوں نے ہر زمانے میں ملحوظ رکھا ہے۔ مکی عہد میں وہ مشرکین کے ساتھ اور ان کے درمیان رہتے تھے۔ حبشہ میں مہاجرین کی بود و باش عیسائیوں کے درمیان تھی۔ مدینہ کے اطراف میں یہودیوں کے قبائل آباد تھے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کی معاشرت تھی۔ ان مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان خوش گوار سماجی تعلقات تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر کبھی قدغن نہیں لگائی اور کبھی انھیں محدود کرنے کی کوشش نہیں کی۔

تقریبات۔ سماجی زندگی کا ایک اہم حصہ

انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ مختلف مناسبتوں سے دوسرے انسانوں سے ملاقات کرے، ان کی خوشیوں میں شریک ہو اور انھیں اپنی خوشیوں میں شریک کرے، وہ کسی مصیبت کا شکار ہوں تو انھیں دلاسا دے اور جب خود اس پر کوئی افتاد پڑے تو دوسروں سے تسلّی اور ہم دردی حاصل کرے۔ خوشی و مسرت اور غم و اندوہ کے مواقع پر مختلف رشتوں سے جڑے لوگ جب کہیں جمع ہوتے ہیں تو انھیں تقریبات کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ تقریبات سماجی بھی ہوسکتی ہیں اور مذہبی بھی۔ مذہبی تقریبات میں کچھ مخصوص رسوم بھی انجام دی جاتی ہیں، جو کسی عقیدہ پر مبنی ہوتی ہیں۔

کثیر مذہبی معاشرہ میں رہنے والے مختلف طبقات کے افراد جب اپنی تقریبات منعقد کرتے ہیں تو سماجی تعلقات کی بنا پر دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو بھی مدعو کرتے ہیں۔ مسلمان اپنی تقریبات میں اپنے غیر مسلم پڑوسیوں، ملاقاتیوں، کاروباری شرکاء اور بسا اوقات مذہبی نمائندہ شخصیات کو دعوت دیتے ہیں تو غیر مسلم بھی اپنی تقریبات میں اپنے مسلمان دوستوں کو شریک کرتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کی تقریبات میں مسلمانوں کی شرکت کے کیا حدود و قیود ہیں، جن کی رعایت کی جانی چاہیے؟ موجودہ دور میں یہ سوال اس لیے بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے مقصد سے مسلمانوں کی جانب سے غیر مسلموں کو اپنی تقریبات میں مدعو کرنے اور غیر مسلموں کی جانب سے مسلمانوں کو اپنی تقریبات میں بلانے کا رجحان بڑھا ہے اور اسے وقت کی ضرورت قرار دیا جارہا ہے۔

توحید۔ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ

مذکورہ بالا سوال کا جواب تلاش کرنے اور اس کی جزئیات پر غور کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عقیدۂ توحید کی اہمیت پر کچھ روشنی ڈال دی جائے۔

توحید اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ اس کے مقابلہ میں اس نے شرک پر سخت تنقید کی ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں لوگ شرک و بت پرستی میں مبتلا تھے۔ عیسائیوں نے غلو کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنالیا تھا۔ اس کے بعض فرقے 'اقانیم ثلاثہ' کا عقیدہ رکھتے تھے۔ قریش نے ہزاروں دیوی دیوتا بنا رکھے تھے، جن کے آگے وہ اپنی جبینِ نیاز خم کرتے تھے۔ قرآن نے ان تمام فرقوں کی گم راہی واضح کی اور شرک کو ناقابل معافی جرم قرار دیا:

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ وَمَن يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْماً عَظِيماً (النساء: ۴۸)

''اللہ بس شرک کو ہی معاف نہیں کرتا، اس کے ما سوا دوسرے جس قدر گناہ وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھہرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی''۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''آدمی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا تو اس کے نامۂ اعمال میں تین طرح کے اعمال ہوں گے۔ کچھ اعمال وہ ہوں گے جنھیں اللہ تعالیٰ کسی بھی صورت میں معاف نہیں کرے گا اور یہ شرکیہ اعمال ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ (المائدۃ: ۷۲)

''جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کردی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''۴؎

اس لیے غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت کرتے وقت ان تمام اعمال سے لازماً پرہیز کیا جائے گا جو صراحۃً شرکیہ ہوں، یا ان میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہو۔

تشبہ سے ممانعت

اس سلسلے میں ایک دوسرا اصول بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی شریعت میں مسلمانوں کو اپنا تشخص برقرار رکھنے پر زور دیا گیا ہے اور انھیں دیگر قوموں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من تشبّہ بقوم فھو منھم ۵

''جس شخص نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انھی میں سے ہے''۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

لیس منا من تشبّہ بغیرنا ۶

''وہ ہم میں سے نہیں جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے''۔

عہد نبوی میں یہود و نصاریٰ کا شمار مذہبی اقوام میں ہوتا تھا۔ عبادات اور معاشرت میں وہ بہت سے ایسے کام انجام دیتے تھے جو ان کی پہچان بن گئے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو ان اعمال میں ان کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا۔

غیر مسلموں کو سلام کرنا

کسی تقریب میں شرکت کی جائے تو سب سے پہلے سامنا میزبان سے ہوتا ہے۔ اگر وہ غیر مسلم ہو تو کیا اس سے سلام کیا جا سکتا ہے؟

غیر مسلم کو سلام کرنے کے تعلق سے احادیث میں مختلف احکام ملتے ہیں۔ بعض احادیث میں انھیں سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے، جب کہ بعض صحابہ و تابعین سے ثابت ہے کہ وہ انھیں سلام کرتے تھے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمع میں اگر غیر مسلموں کے ساتھ کچھ مسلمان بھی ہوں تو سلام کیا جا سکتا ہے۔ ایک بحث یہ بھی ملتی ہے کہ سلام کرنے یا سلام کا جواب دینے کے لیے کیا الفاظ استعمال کیے جائیں؟ کیا انھیں اسی طرح سلام کیا جا سکتا ہے جس طرح مسلمانوں کو کیا جاتا ہے؟ یا ان کے لیے دیگر مناسب الفاظ کا استعمال کیا جائے گا؟ اس موضوع پر مولانا سید جلال الدین عمری نے تفصیل سے لکھا ہے۔ (احادیث اور آثار صحابہؓ کے لیے ان کی طرف رجوع کیا جائے) ۷؎

آخر میں انھوں نے پوری بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں درج کیا ہے:

''ہمیں ایک ایسے معاشرے کے بارے میں سوچنا چاہیے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ملا جلا اور مخلوط معاشرہ ہے، جہاں دونوں کے درمیان ثقافتی، سماجی، معاشی، غرض مختلف نوعیت کے تعلقات موجود ہیں اور دونوں قانونی اور دستوری روابط میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے معاشرے میں غیر مسلموں کو مسنون طریقے سے سلام کیا جائے تو یہ مخالفِ سلف عمل نہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے، اس طرح وہ آہستہ آہستہ اسلامی آداب سے مانوس ہوتے چلے جائیں اور ان کی معنویت ان پر زیادہ بہتر طریقے سے واضح ہو جائے۔ اس میں قباحت محسوس ہو تو ان کے لیے عزت و احترام، محبت و خیر خواہی کے دوسرے الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ اس بات کا ضرور خیال رکھنا ہوگا کہ تعلقات کے اظہار میں ایسے طریقے نہ اختیار کیے جائیں جو کسی دوسرے مذہب یا تہذیب کے مخصوص شعار کی حیثیت رکھتے ہوں اور ایسے الفاظ نہ استعمال کیے جائیں جو اسلامی عقائد سے متصادم ہوں''۔ ۸؎

تحائف کا تبادلہ

تقریبات اگر خوشی کی ہوں تو ان میں تحائف بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو تحائف دیے جاسکتے ہیں اوران کے تحائف قبول بھی کیے جاسکتے ہیں۔

کسریٰ (شاہِ ایران)، قیصر (شاہ روم) اور دیگر بادشاہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تحفے بھیجے، جنھیں آپؐ نے قبول فرمایا اور بسا اوقات ان کے جواب میں آپ نے بھی تحفے بھیجے۔ قبیلۂ حمیر کے بادشاہ 'ذویزن' نے آپ کی خدمت میں ایک قیمتی جوڑا بھیجا۔ آپؐ نے اسے قبول فرمایا اوراسی طرح کا ایک قیمتی جوڑا اسے بھی تحفے میں بھیجا۔ ۹ نجاشی شاہِ حبشہ نے آپؐ کو ایک خچر ہدیہ کیا تھا، جسے آپ سواری کے لیے استعمال فرماتے تھے۔ ۱۰ مقوقس شاہِ اسکندریہ (مصر) نے آپ کی خدمت میں بہت سے تحائف بھیجے تھے، مثلاً ایک ہزار مثقال سونا، بیس (۲۰) ملائم کپڑے، دلدل نامی خچر، یعفور نامی گدھا، شیشے کا پیالہ، لکڑی کی سرمہ دانی، آئینہ، کنگھی وغیرہ۔ اس نے ساتھ میں دو باندیاں اور ایک غلام بھی بھیجا تھا، جن میں سے ایک حضرت ماریہؓ کو آپ نے اپنی ملکِ یمین میں لے لیا تھا۔ ۱۱

ماکولات و مشروبات

کھانے پینے کا اہتمام تقریبات کا لازمی جزء سمجھا جاتا ہے۔ کسی تقریب میں یہ نہ ہوتو وہ ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ مختصر تقریبات میں چائے بسکٹ، پھل، میوہ جات وغیرہ پر اکتفا کیا جاتا ہے، جب کہ بڑی تقریبات میں انواع واقسام کے کھانوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کھانے پینے کے سلسلے میں اسلام نے جو بنیادی تعلیمات دی ہیں انھیں تقریبات میں بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ غیر مسلموں کی تقریبات میں شراب اور دیگر نشہ آور مشروبات کا استعمال عام ہے۔ اسلام میں اس کو صراحت کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے اوراس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدۃ:۹۰)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہ شراب، جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی''۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کل مسکر خمر و کل مسکر حرام ۱۲

''ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے''۔

۲۔ اسلام میں جن جانوروں کا گوشت کھانا حرام قرار دیا ہے ان میں سے ایک خنزیر ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کی صراحت آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ (البقرۃ:۱۷۳)

''اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے کہ تم مردار نہ کھاؤ، خون سے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو''۔ ۱۳

۳۔ محرمات میں (جیسا کہ آیتِ بالا میں صراحت ہے) مردار بھی ہے۔ سورۃ المائدہ (آیت نمبر ۳) میں صراحت ہے کہ چاہے وہ طبعی موت مرا ہو یا گلا گھٹنے یا چوٹ کھانے یا کسی بلند مقام سے گرنے یا دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے اس کی موت واقع ہوئی ہو، بہر حال اس کا گوشت کھانا حرام ہے۔

۴۔ جس جانور کو غیر اللہ کے نام پر یا بتوں کے آستانوں پر ذبح کیا گیا ہو، اس کا گوشت کھانا بھی حرام ہے۔ قرآن مجید میں محرمات کی جو فہرست دی گئی ہے، اس میں یہ بھی ہے:

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (البقرۃ:۱۷۳) ۱۴

''اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو''۔

سورۂ مائدہ میں محرمات کی فہرست میں یہ بھی مذکور ہے:

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (المائدۃ:۳)

''اور وہ جانور جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو''۔

۵۔ اسی طرح اس جانور کا گوشت کھانا بھی حرام قرار دیا گیا ہے جسے ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلاَ تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ (الانعام:۱۲۱)

''اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اس کا گوشت نہ کھاؤ۔ ایسا کرنا فسق ہے''۔

۶۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ اسلام میں غیر مسلموں (مشرکین) کے ذبیحے کو حرام قرار دیا گیا ہے، البتہ اس معاملہ میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ (المائدۃ:۵)

''آج تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے''۔

اس آیت میں لفظ 'طعام' (کھانا) آیا ہے، جس میں عموم پایا جاتا ہے۔ لیکن متعدد صحابہ و تابعین سے مروی ہے کہ اس سے مراد ذبیحہ ہے۔ علامہ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں صحابہ و تابعین کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

وهذا أمر مجمع عليه بين العلماء أن ذبائحهم حلال للمسلمين، لأنهم يعتقدون تحريم الذبح لغير الله ولا يذكرون على ذبائحهم الا اسم الله وان اعتقدوا فيه تعالىٰ ما هو منزّه عن قولهم۔ ۱۵

''علماء کا اجماع ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے، اس لیے کہ وہ غیر اللہ کے نام سے ذبح کو حرام سمجھتے ہیں اور اللہ ہی کے نام سے ذبح کرتے ہیں، اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بعض ایسے اعتقادات رکھتے ہیں، جن سے وہ پاک ہے''۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس ذیل میں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

''اہل کتاب کا ذبیحہ ہمارے لیے حلال ہونے کی عام اجازت دینے سے پہلے اس فقرہ کا اعادہ فرمادیا گیا ہے کہ ''تمھارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئیں ہیں''۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب اگر پاکی و طہارت کے ان قوانین کی پابندی نہ کریں جو شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں، یا اگر ان کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ اللہ کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کریں یا اس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیں تو اسے کھانا ہمارے لیے جائز نہیں۔ اسی طرح اگر ان کے دسترخوان پر شراب یا سور یا کوئی اور حرام چیز ہو تو ہم ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے''۔ ۱۶؎

غیر مسلموں کی تیار کردہ چیزیں، مثلاً مٹھائیاں یا کھانے کی دوسری چیزیں، ان کا استعمال مسلمانوں کے لیے بلا کراہت جائز ہے۔ بشرطے کہ ان میں کسی حرام چیز کی آمیزش نہ ہو اور بتوں پر ان کا چڑھاوا نہ کیا گیا ہو۔

تعزیت اور جنازہ میں شرکت

کسی غیر مسلم عزیز، پڑوسی، کاروباری شریک یا ملاقاتی کا انتقال ہو جائے تو اس کی تعزیت کرنی چاہیے۔ یہ ایک سماجی تقاضا ہے، جس کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ البتہ تعزیت کرتے ہوئے کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیے، جو کسی اسلامی عقیدے سے ٹکراتی ہو۔

حضرت حسن بصریؒ کی مجلس میں ایک نصرانی شریک ہوتا تھا۔ اس کا انتقال ہوا تو انھوں نے اس کے بھائی سے مل کر تعزیت کی۔ فرمایا: ''تم پر جو مصیبت آئی ہے، اس پر صبر کرو۔ اللہ تمھیں اس کا اچھا بدلہ عطا کرے گا''۔ ۱۷؎

غیر مسلم کے جنازے میں شرکت کی جا سکتی ہے۔ اس کا مقصد وفات پانے والے شخص سے تعلق کا اظہار اور اس کے عزیزوں اور متعلقین کو تسلّی اور دلاسا دینا ہوتا ہے۔ تجہیز و تکفین میں، ظاہر ہے، مذہبی امور اور ہدایات کی پابندی کی جاتی ہے، غیر مسلم اپنے طریقے پر اس کا نظم کریں گے، لیکن ایک مسلمان کو بہ ہر حال اس کی اجازت ہے کہ وہ انسانی تعلق اور ہم دردی کے اظہار کے لیے اس موقع پر موجود رہے اور اس کے جنازے میں شریک ہو۔ متعدد صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظام سے اس کا عملی ثبوت ملتا ہے۔ ۱۸؎

البتہ اس موقع پر یہ احتیاط لازمی ہے کہ مسلمان کسی ایسے عمل میں شریک نہ ہو جو اسلامی نقطۂ نظر سے ناجائز ہو، مثلاً چتا میں آگ لگانا، کہ اسلامی شریعت میں انسانی نعش کو آگ میں جلانے کی اجازت نہیں ہے، یا دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کرنا، کہ غیر مسلم میت کے لیے ایسا کرنے سے صراحۃً منع کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُواْ أَن يَسْتَغْفِرُواْ لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُواْ أُوْلِي قُرْبَى مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ (التوبۃ:۱۱۳)

''نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جب کہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں''۔

احادیث میں ہے کہ یہ آیت اللہ کے رسول ﷺ کے عزیز چچا جناب ابوطالب کی وفات کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میں ان کے لیے برابر دعائے مغفرت کرتا رہوں گا جب تک کہ مجھے ایسا کرنے سے منع نہ کر دیا جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔۱۹؎

اسی طرح ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی۔ وہاں آپ کے اوپر گریہ کی کیفیت طاری ہوگئی اور آپؐ کو دیکھ کر صحابۂ کرام بھی رونے لگے۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا:

استأذنت ربی أن استغفر لها فلم یأذن لی۔۲۰

''میں نے اپنے رب سے ماں کے استغفار کے لیے اجازت طلب کی، لیکن مجھے اجازت نہیں ملی''۔

قومی یا سماجی تقریبات میں شرکت

ملک میں بعض ایسی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں جن کی نوعیت قومی ہوتی ہے اور ان میں عموماً شرکیہ افعال انجام نہیں دیے جاتے، اگرچہ تقریبات منعقد کرنے والے چوں کہ ہندو ہوتے ہیں اس لیے ان کے بعض افعال میں ہندوانہ کلچر کی جھلک آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر یوم آزادی، یوم جمہوریہ اور بعض دیگر تقریبات میں ملک کے جھنڈے کو لہرایا جاتا ہے اور اسے سلامی دی جاتی ہے۔ ان مواقع پر قومی ترانہ پڑھا جاتا ہے تو تمام حاضرین کے لیے کھڑا ہونا لازمی سمجھا جاتا ہے۔

کیا ایسی تقریبات میں مسلمان شریک ہوسکتا ہے؟ بعض فقہاء مثلاً مفتی کفایت اللہ اور مولانا عبدالرحیم لاجپوری وغیرہ نے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔۲۱؎ کل ہند تعمیر ملت حیدرآباد کے سمینار منعقدہ ۲۰۰۰ء میں اس سلسلے میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی:

''قومی پرچم کو سلامی دینا اور قومی ترانہ کے درمیان کھڑا ہونا، عبادت و بندگی کے قبیل سے نہیں، بلکہ ملک سے محبت و تعلق کے اظہار کی ایک علامت سمجھی جاتی ہے۔ اس پہلو سے اس میں گنجائش ہے، لیکن اسلامی مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے''۔۲۲؎

بعض تقریبات کے آغاز میں شمع جلائی جاتی ہے، ناریل پھوڑا جاتا ہے، ربن کاٹی جاتی ہے، یا اس طرح کے دیگر کام انجام دیے جاتے ہیں۔ یہ تمام کام اسلامی تہذیب سے مغایر ہیں، اس لیے ان کی انجام دہی پسندیدہ نہیں، لیکن اگر ان کا کوئی شرکیہ پس منظر نہ ہو تو ایسی تقریبات میں شرکت کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

مذہبی تقریبات میں شرکت

غیر مسلموں کی کچھ تقریبات خالص مذہبی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان میں شرکیہ افعال انجام دیے جاتے ہیں۔ ایسی تقریبات میں شرکت عام حالات میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَاماً (الفرقان:۷۲)

''(اور رحمن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو پر ان کا گزر ہوتا ہے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں''۔

اس آیت میں 'زور' سے مراد بعض صحابہ و تابعین (مثلاً حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، ابوالعالیہ، مجاہد، طاؤس، ابن سیرین، ربیع بن انس اور ضحاک وغیرہ) نے مشرکوں کے تہوار لیے ہیں۔۲۳؎

عہد نبوی میں ایک شخص نے نذر مانی کہ 'بوانہ' نامی مقام پر ایک اونٹ ذبح کرے گا۔ اس نے اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے اپنی اس نذر کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا وہاں جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت ہے، جس کی پرستش کی جاتی ہو؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے دریافت کیا: کیا وہاں جاہلیت کے تہواروں میں سے کوئی تہوار منایا جاتا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: نہیں۔ تب آپؐ نے فرمایا: اپنی نذر پوری کرو۔۲۴؎

ایک عورت نے اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: میں نے نذر مانی تھی کہ فلاں جگہ (جہاں عہد جاہلیت میں لوگ جانور ذبح کیا کرتے تھے) جانور قربان کروں گی۔ آپؐ نے دریافت کیا: کیا وہاں اہل جاہلیت کسی مٹی یا پتھر کے بت کے لیے قربانی کرتے تھے؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ تب آپؐ نے فرمایا: اپنی نذر پوری کرو۔۲۵؎

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان مقامات پر، جہاں بتوں کی پرستش کی جاتی ہو اور شرکیہ افعال انجام دیے جاتے ہوں، نذر کا جانور ذبح کرنا ممنوع ہے تو وہاں منعقد ہونے والے تہواروں میں شرکت بھی جائز نہ ہوگی۔

علامہ ابن تیمیہ نے درج بالا احادیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

> ”جب جاہلی میلوں اور عبادت گاہوں پر کسی عقیدت مندانہ حاضری سے منع کیا گیا ہے تو خود جاہلی تہواروں میں شرکت بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگی“۔۲۶؎

اسی وجہ سے متعدد اصحابِ افتاء نے غیر مسلموں کی مذہبی تقریبات میں شرکت کو ممنوع اور حرام قرار دیا ہے۔۲۷؎

البتہ اگر کسی شخص کو دینی مصلحت، ملّی تقاضے، دعوتی جذبے، تالیف قلب یا اسلام سے قریب کرنے کے مقصد سے غیر مسلموں کی کسی مذہبی تقریب میں شریک ہونا پڑے تو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے، بشرطے کہ وہ کسی مذہبی عمل میں شریک نہ ہو اور اس موقع پر جو مذہبی رسوم انجام دی جاتی ہیں، ان سے دور رہے۔ کتبِ سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عکاظ، ذوالمجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں شرکت فرماتے تھے اور وہاں لوگوں سے مل کر ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے تھے۔

اسی طرح مختلف تہواروں کے موقع پر اگر خیر سگالی کے طور پر کوئی پارٹی ہوتی ہو، جیسے ہولی ملن وغیرہ اور اس میں مذہبی رسوم نہ انجام دی جاتی ہوں تو وسیع تر دعوتی مفاد، خیر سگالی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے پیش نظر اس میں شرکت کی جاسکتی ہے۔

مذہبی رسوم کی ایک مثال پیشانی پر ’قشقہ‘ لگانا ہے کہ اس کا تعلق ہندوؤں کے مذہبی شعائر سے ہے، اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔۲۸؎

بعض تقریبات میں ’وندے ماترم‘ گیت گایا جاتا ہے۔ یہ گیت کھلے طور پر شرکیہ باتوں پر مشتمل ہے، اس لیے کہ اس میں ’بھارت ماتا‘ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک ’بھارت‘ کو ایک دیوی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے اور ملک کے مختلف مقامات پر اس کی مورتیاں نصب کی گئی ہیں اور مندر بنائے گئے ہیں۔ اس بنا پر کسی مسلمان کے لیے یہ گیت گانا جائز نہیں ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی کے سمینار منعقدہ حیدرآباد، ۲۰۔۲۲/جون ۲۰۰۴ء میں اس سلسلے میں یہ قرارداد منظور کی گئی تھی:

> ”وندے ماترم جیسے گیت میں شرکیہ الفاظ ہیں اور ہندوستان کی سرزمین کو معبود کا درجہ دیے جانے کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے اس جیسے گیت کا پڑھنا شرعاً حرام ہے اور ان پر اس سے احتراز کرنا لازم ہے۔۲۹؎

حواشی و مراجع

۱۔ المفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، المطبعۃ المیمنیۃ مصر، ۱۳۲۴ھ، ص ۹۳ (البرّ: التوسّع فی الاحسان الیه)
۲۔ النکت والعیون (تفسیر الماوردی)، مطابع المقھوی، کویت، ۱۴۰۲ھ، ۴/ ۲۲۳
۳۔ احکام القرآن، ابن العربی، مطبعۃ السعادۃ، مصر، ۱۳۳۱ھ، ۲/ ۲۴۹ (أی تعطوھم قسطاً من أموالكم علی وجه الصلة)
۴۔ مسند احمد، ۲۶۰۳۱
۵۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشھرۃ، ۴۰۳۱
۶۔ ترمذی، کتاب الاستئذان، ۲۶۹۵
۷۔ غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق، مولانا سید جلال الدین عمری، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۸۔۱۳۷
۸۔ حوالہ سابق، ص ۱۳۶۔۱۳۷
۹۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس المرتفع
۱۰۔ زاد المعاد، ابن قیم، ۱/ ۱۳۴
۱۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: ’غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق‘ کی بحث ’غیر مسلم سے تحائف کا تبادلہ‘، ص ۱۴۸۔۱۵۹
۱۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاشربۃ، باب النھی عن المسکر، ۳۶۷۹
۱۳۔ مزید ملاحظہ کیجیے، المائدۃ: ۳ اور النحل: ۱۱۵
۱۴۔ مزید ملاحظہ کیجیے، المائدۃ: ۳، الانعام، ۱۴۵، النحل: ۱۱۵
۱۵۔ تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر
۱۶۔ تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۱/ ۴۴۶۔۴۴۷
۱۷۔ کتاب الخراج، ابویوسف، ص ۲۱۷
۱۸۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے مصنف عبدالرزاق، ۶/ ۳۶۔۳۸
۱۹۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا قال المشرک عند الموت لا الہ الا اللہ، ۱۳۶۰
۲۰۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب استئذان النبی ربّہ عزّ وجلّ فی زیارۃ قبر امّہ
۲۱۔ فتاویٰ رحیمیہ، ۶/ ۲۸۸ ۲۲۔ ماہ نامہ الرشاد، جلد ۴۰، شمارہ ۳۳۵، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۵
۲۳۔ تفسیر ابن کثیر، الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی)، تفسیر آیت مذکور
۲۴۔ سنن ابی داؤد، کتاب الایمان، باب مایؤمر بہ من الوفاء بالنذر، ۳۳۱۳، صحّحه الألبانی
۲۵۔ سنن ابی داؤد، حوالۂ سابق، ۳۳۱۲، قال الألبانی: حسن صحیح
۲۶۔ اقتضاء الصراط المستقیم، ابن تیمیۃ،
۲۷۔ مثلاً ملاحظہ کیجیے، فتاویٰ محمودیہ: ۱۴/ ۴۰۴، مجموعۃ الفتاویٰ: ۲/ ۱۱۹، فتاویٰ رشیدیہ، ص ۵۵۶، کفایت المفتی: ۹/ ۳۳۶
۲۸۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، ایفا پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۲۷
۲۹۔ نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، جون ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۳

مسیحیت میں امن کی جہات

ڈاکٹر تنویر قاسم

مسیحیت کا نقطۂ آغاز ہی امن کی تلاش ہے۔ اس میں اخوت و مساوات، ہمدردی اور خدمت اور باہمی محبت و یگانگت پر زور دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہود کے ادنی طبقات اور یونان وروما کی کثیر تعداد عیسائیت میں داخل ہو کر روحانی تسکین حاصل کرنے میں سبقت لے گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں اور حواریوں کو تعلیم دی تھی کہ لوگ تمھیں اذیت سے ہمکنار کریں گے، لیکن تم ان پر صبر کرنا۔ یہی تمھارا اجر عظیم ہوگا۔

معاشرے میں عدم تشدد اور راست بازی کے ماحول کو قائم رکھنا اللہ کے محبوب بندوں کا شعار ہے اور انہی کے لیے ’خدا کی بادشاہت‘ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ لوگوں کو توبہ اور محبت کی تلقین فرمایا کرتے تھے اور امن و محبت کے معاملے میں دوست اور دشمن کے درمیان تمیز روا نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے تعصب اور نفرت کے رویوں سے اجتناب کرنے اور ستانے والوں کے ساتھ بھی احسان کرنے کی تلقین کی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم اس لیے محبت کرتے ہیں کیوں کہ خدا نے پہلے ہم سے محبت کی۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے میں خدا سے محبت کرتا ہوں، لیکن وہ اپنے عیسائی بھائیوں اور بہنوں سے نفرت کرتا ہے تو ایسا شخص جھوٹا ہے۔ وہ شخص، جو اپنے بھائی کو دیکھ سکتا ہے، پھر بھی اس سے نفرت کرتا ہے، اس خدا سے محبت نہیں کر سکتا جس کو وہ دیکھ نہیں سکتا۔ اس نے ہم کو یہ حکم دیا ہے:

> ”جو کوئی خدا سے محبت کرتا ہے اسے چاہئے کہ اپنے بھائی سے بھی محبت رکھے۔“ (یوحنا، ۲۱:۴)

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن میں مسیحی تصورِ امن کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

> In the history of the church, peace has been on the one hand as calm for the soul and on the other hand as social and political reconciliation and the establishment of a just order. This had led to doctrines is a just war …. But more general statement speak of individual and communal well being. [1]

کلیسا کی تاریخ میں امن ایک طرف روحانی سکون کا نام ہے اور دوسری طرف سیاسی، معاشرتی، ہم آہنگی اور قیام عدل کا نام بھی ہے اور اسی سے انصاف کی جنگ کا تصور بھی نکلا، لیکن اس کا عمومی مفہوم انفرادی اور اجتماعی بھلائی کا ہے۔

اناجیل میں تعلیماتِ امن

عیسائیت میں عہد نامہ جدید کی تعلیمات کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ امن کے بارے میں اناجیل کی درج ذیل تعلیمات ہیں۔ اس کا تعلق دنیا و آخرت دونوں سے ہے۔ سیدنا عیسیٰؑ نے فرمایا ہے:

''امن ہی میں تمہارے درمیان چھوڑے جارہا ہوں اور امن ہی تمہیں دیتا ہوں۔ سو تم اپنے آپ کو خوف و ابتلا میں مت ڈالو''۔ (یوحنا، ۱۴: ۲۷)

نمک کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

'نمک ایک بہترین چیز ہے، لیکن اگر نمک اپنے ذائقہ کو ضائع کردے تو 'تم اس کو پھر دوبارہ نمک نہیں بنا سکتے۔ اسی وجہ سے تم اچھائی کا مجسم بنو اور ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہو''۔ (یوحنا، ۱۴: ۲۷)

''امن کی خدا کے ہاں سب سے زیادہ عظمت اور کرۂ ارض میں بسنے والے خندہ رو انسانوں کے ہاں سب سے زیادہ قدر و منزلت ہے۔'' کیوں کہ خدا پریشانی نہیں، بلکہ امن لاتا ہے''۔ (کرنتھیوں، ۱۴: ۳۳)

امن کی عموماً تین سطحوں پر ضرورت ہوتی ہے:

۱۔ انفرادی سطح پر۔
۲۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ۔
۳۔ اقوام عالم کے مابین۔

انفرادی امن

قلبی اطمینان سے ہی انفرادی امن حاصل ہوتا ہے۔ جس معاشرہ میں ایسے افراد پائے جائیں جنھیں طمانینت قلبی حاصل ہو وہی پرامن معاشرہ کہلاتا ہے۔ طمانینت قلب کا مطلب ہے خدا کی چاہت اور اس کا تقرب ہے، جس کے نتیجہ میں بندہ اس کا مطیع و فرماں بردار بن جاتا ہے اور اپنی ذات کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ انجیل میں ہے:

''اور اسی کوشش میں رہو کہ روح کی یگانگی صلح کے بند سے بندھی رہے۔ ایک ہی بدن ہے اور ایک ہی روح۔ چنانچہ تمہیں جو بلائے گئے تھے اپنے بلائے جانے سے امید بھی ایک ہی ہے۔ ایک ہی خداوند ہے۔ ایک ہی ایمان۔ ایک ہی بپتسمہ۔ اور سب کا خدا اور باپ ایک ہی ہے، جو سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور سب کے اندر ہے۔''
(افسیوں، ۴: ۳۔۶)

سیدنا عیسیٰؑ اپنی معاشرتی زندگی میں تمام تر وقت خدمتِ خلق میں گزارتے تھے۔ وہ بیماروں کا علاج اور ان کا تزکیہ کرتے تھے، حتیٰ کہ ان کے اردگرد ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ رات کو پہاڑوں پر نماز و ذکر کے لیے بھی جاتے تھے اور پوری پوری رات اسی عالم میں گزار دیا کرتے تھے۔

صلح پسندی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''مبارک ہیں وہ لوگ جو صلح کراتے ہیں۔ وہ تو خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔'' (متی، ۵: ۹)

قلب و ذہن کی طہارت اور تزکیہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انسان کے قلب و ذہن کے تزکیے پر بہت زور دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''کسی عورت کی جانب شہوت زدہ نظر سے دیکھنا ہی زنا کاری کے مترادف ہے۔'' (متی، ۵: ۲۸)

ہمارے نادیدہ خیالات اور احساسات ترغیب دیتے ہیں۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ دراصل ہماری شخصیت گری اور فطرت میں ہمارے افکار اور احساسات کا کردار بنیادی اور حتمی ہوتا ہے۔ لیکن روح ہمیں محبت، خوشی، اطمینان، تحمل، مہربانی، نیکی، ایمان داری، حلم اور پرہیزگاری وغیرہ سکھاتی ہے۔ (گلتیوں، ۵: ۲۲)

معاشرتی امن

انسانی تعلقات بہت سے اسباب سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں شوہر اور بیوی کے مابین خوش گوار ازدواجی تعلقات، اسی طرح ملازمین اور مالکوں کے مابین، اساتذہ اور طلبہ کے درمیان، امیر اور غریب کے درمیان خوش گوار تعلقات کی ضرورت ہے۔ خلاصہ یہ کہ امن معاشرتی سطح پر موجود تمام طبقات کے لیے ضروری ہے۔

معاشرے کے اندر عدم اطمینان اور بدامنی و بے سکونی کی اصل وجہ ہمارا گناہ کی طرف میلان ہے۔ انسانوں کے دل میں تکبر، کینہ و حسد اور خودغرضی جیسے سفلی جذبات پائے جاتے ہیں۔ جب ہم دوسروں کے احساسات کو ٹھیس پہنچاتے ہیں تو گویا ہم دشمنی اور فساد کا بیج بو دیتے ہیں۔ اگر ہم اپنی انانیت دوسروں کی خاطر قربان کردیں تو خاطر خواہ تبدیلی آ سکتی ہے اور ہماری حالت بدل سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے موخر الذکر رویہ اپنانے کی ترغیب دی ہے۔ انھوں نے فرمایا:

"تو اب اے بھائیو اور بہنو! میں خدا حافظ کہتا ہوں۔ کامل ہونے کی کوشش کرو۔ میں نے جن باتوں کو کرنے کے لیے لکھا ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر اور سلامتی سے رہو تو بے لوث محبت والا خدا اور اس کی سلامتی تم پر رہے گی"۔
(کرنتھیوں کے نام دوسرا خط، ۱۳:۱۱)

"تم ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہو، روح کے ذریعے امن سے رہو۔ تم سب مل کر اس اتحاد کو بچائے رکھو جو سلامتی سے حاصل ہوا ہے"۔ (افسیوں، ۴:۳)

عیسائی تعلیمات کے مطابق معاشرہ کے افراد کے مابین امن وسکون کو رواج دینے کے لیے اصلاح کی از حد ضرورت ہے، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم سب سے پہلے اپنی انفرادی اصلاح کریں، اللہ کے ساتھ اپنے تعلق میں پختگی لائیں اور اس کے لیے وہ راستہ اختیار کریں جس کا اللہ نے اپنے نبی سیدنا عیسیٰؑ کے ذریعے حکم دیا ہے۔

ربانی امن

اناجیل بڑی شد و مد کے ساتھ اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ امن کا بانی صرف خدا ہے اور کائنات میں اس وقت تک پائیدار امن قائم نہیں ہوسکتا جب تک ربانی امن کو اس دنیا میں فروغ نہ دیا جائے۔

جب سیدنا عیسیٰؑ یروشلم میں واقع اپنی جائے پیدائش بیت اللحم میں ہویدا ہوئے تب فرشتوں نے ان الفاظ کے ساتھ زمزمہ پردازی کی تھی کہ" ہر اوجِ عظمت صرف خدائے برتر ہی کے لائق ہے اور امنِ ارضی ان لوگوں کے لیے ہے جس سے وہ راضی ہو جائے"۔ (متی، ۲:۱۔۲، لوقا، ۲:۱۱۔۱۴)

انجیل کا پیغام یہی ہے کہ وہ نظم وضبط کا خدا ہے نہ کہ انتشار و بدنظمی کا، جس نے دنیا کی بدنظمی اور بے ضابطگی میں ایک ضابطے کی کارروائی کی، تاکہ اس دنیا کو اس کی اصل اور درست حالت میں لایا جاسکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ہی اس نے جناب مسیح کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے خدائے برتر و اعلیٰ کی بھرپور تائید و رضا کے ساتھ اپنا مشن پورا کر دکھایا۔ ایک جم غفیر انہیں خوش آمدید کہہ رہا تھا، جیسا کہ انجیل میں ہے:

"وہ پکار رہے تھے: خداوند کے نام پر آنے والے بادشاہ کے لیے خوش آمدید۔ آسمان میں امن وامان ہو اور خدا کے لیے جلال وعظمت ہو"۔ (لوقا، ۱۹:۳۸)

آمدِ مسیح امن کی ضمانت

عہد نامہ جدید اس بات کا دعوے دار ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام ہی امن کی ضمانت ہیں:

"کیوں کہ مسیح کی وجہ سے ہم امن میں ہیں۔ مسیح نے ہم دونوں کو ایک کر دیا۔ یہودی اور غیر یہودی دونوں کو اس طرح علحیدہ کر دیا گیا تھا جیسے ان کے درمیان ایک دیوار ہو۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے، لیکن مسیح نے اس دشمنی کو اپنا جسم دے کر دور کیا۔ یہودی شریعت میں کئی احکام ہیں، لیکن مسیح نے اس شریعت کو ختم کیا۔ مسیح کا مقصد یہ تھا کہ دونوں گروہوں کے لوگوں کو نئے انسان بنائیں۔ ایسا کر کے مسیح نے امن قائم کیا۔ مسیح نے آ کر تم غیر یہودی لوگوں کو امن کی تعلیم دی، جو خدا سے بہت دور تھے اور اس نے یہودیوں کو بھی، جو خدا کے نزدیک تھے، امن کی تعلیم دی۔" (افسیوں، ۲:۱۴، ۱۵، ۱۷)

رسولوں کے اعمال میں یہود کے لیے خوش خبری دی گئی ہے، جو امن سے مشروط ہے:

"خدا نے یہودیوں سے کہا ہے اور انہیں خوش خبری دی ہے کہ امن وامان یسوع مسیح سے ہی آتا ہے۔ یسوع ہی سب لوگوں کا خداوند ہے۔" (اعمال، ۱۰:۳۶)

امن کے متعلق سیدنا مسیح علیہ السلام کے مزید ارشادات درج ذیل ہیں:

"جہاں تک تم سے ممکن ہو سکے، سب کے ساتھ امن سے رہو۔" (رومیوں، ۱۲:۱۸)

کرنتھیوں کے نام پولوس رسول اپنے پہلے خط میں سیدنا مسیح علیہ السلام کو پوری دنیا کے لیے 'امن کی آشا' قرار دیتا ہے:

"میرا مطلب ہے، خدا نے مسیح میں ہو کر دنیا اور اپنے درمیان امن قائم کر لیا۔ خدا نے لوگوں کو مسیح میں ان کے گناہ کے لیے قصوروار نہیں ٹھہرایا اور اس نے امن کے اس پیغام کو ہمیں لوگوں کو سنانے کے لیے دیا۔" (لوقا، ۱۴:۳۲)

مسیحی امن فارمولہ

مسیحیت میں امن مشروط ہے۔ امن کی تعلیمات بلاقید نہیں ہیں۔ امن انہی کے لیے ہے جو باایمان (مسیحی) اور امن کے خواست گار ہوں۔ ایسے لوگ، جو ایمان سے عاری (غیر مسیحی) ہوں اور مسیحی معاشرہ سے جدائی کے طلب گار ہوں، ان کے لیے امن کا فارمولا درج ذیل ہے:

''اگر و یسے مرد جو باایمان نہ ہو اور جدا ہونا چاہے تو اسے ہو جانے دو۔ان حالات میں کوئی بھائی یا بہن پابند نہیں۔ خدا نے ہم کو پر امن زندگی کے لیے بلا یا ہے۔'' (کرنتھیوں اول، ۱۹:۵)

عہد نامہ قدیم میں جس طرح دشمنوں کو نیست و نابود کرنے اور ان کا قتل کرنے کے واضح احکام موجود ہیں، اس طرح کے احکام عہد نامہ جدید میں نہیں ملتے۔اس میں امن کا پیغام نمایاں ہے۔معاشرتی انصاف کی جا بہ بجا تلقین کی گئی ہے:

'اور اپنے پیروں میں امن کی خوش خبری کی نعلین پہن لو، جو تمہیں طاقت سے کھڑے رہنے میں مدد دے گی''۔ (افسیوں، ۱۵:۶)

''تم سب امن اور سلامتی کی زندگی میں رہ کر اس کا اعزاز سمجھو اور اپنے کام کی طرف توجہ دو اور اپنی کمائی اپنے ہاتھ سے کماؤ، ہم تمہیں سب کرنے کے لیے پہلے ہی کہہ چکے ہیں''۔(تھسلنیکیوں اول، ۱۱:۴)

''اور ان کے کام کے سبب سے محبت کے ساتھ ان کی بڑی عزت کرو اور ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہو''۔ (تھسلکیوں اول، ۱۳:۵)

''تم میرے سچے فرزند کی مانند ہو، کیوں کہ تم ایمان رکھتے ہو،فضل و کرم، امن و امان اور سلامتی خدا باپ اور ہمارے خداوند یسوع مسیح کی طرف سے تم پر نازل ہوتا رہے''۔ (تیمتھیس اول، ۲:۱)

'اس کو بہت زیادہ مے نہیں پینا چاہئے اور اسے لوگوں سے لڑنے والا نہیں ہونا چاہئے، اس کو نرم مزاج اور پر امن ہونا چاہئے۔وہ ایسا نہیں ہو جو پیسے سے پیار کرتا ہو''۔ (تیمتھیس اول، ۳:۳)

''جب ہمیں سزا دی گئی تو ہم لوگوں نے خوشی نہیں منائی، بلکہ سزا پانا تو درد سے بھرا ہوا تھا،لیکن سزا پانے کے بعد ہم لوگوں نے سزا سے سبق سیکھا۔ہم لوگ امن و امان میں ہیں، کیوں کہ ہم لوگوں نے سیدھی زندگی گزارنی شروع کر دی ہے''۔(عبرانیوں، ۱۲:۱۱)

''لیکن جو حکمت اوپر سے آتی ہے، پہلے یہ پاک ہے، پھر پر امن۔نرم اور وسیع ذہن آسانی سے قبول کرنے والی نئی سچائی، یہ رحم سے بھر پور نیک عمل کرنے اور دوسروں کے ساتھ ایمان دار اور غیر جانب دار رہتی ہے۔جو لوگ امن کے لیے پر امن طریقے سے کام کرتے ہیں وہ راست بازی کے ذریعہ اچھی چیزوں کو پاتے ہیں''۔(یعقوب، ۳:۱۷۔۱۸)

تشکیل امن

تشکیلِ امن کے دائرے میں آزادی، تحفظ و بقا، فلاح و بہبود، عظمت و رفعت اور سیاسی استحکام وغیرہ سب شامل ہے۔جو شخص بھی ان چیزوں کے لیے کوشاں ہوگا اسے بجا طور پر امن کا علم بردار کہا جائے گا۔انجیل متی عیسائیت کے بنیادی اصول و ضوابط کے تناظر میں سیدنا عیسیٰؑ کے 'پہاڑی کے وعظ' کے حوالے سے یہ روایت کرتی ہے کہ ''امن کی تشکیل کے لیے کوشاں لوگ قابل ستائش ہیں۔انہیں اس کے بدلے میں 'خدا کے بیٹوں' کے لقب سے پکارا جائے گا''۔(متی، ۹:۵)

ہم سایوں سے محبت

حضرت عیسیٰؑ نے ہم سایوں سے محبت کا درس دیا۔ان کے نزدیک ہم سایے سے مراد صرف وہ شخص نہیں ہے، جس سے کوئی رشتہ داری ہو، بلکہ ہر وہ شخص ہے جو کسی بھی طرح کے رابطے میں آئے۔انھوں نے فرمایا:

''اپنے والدین کی عزت کرو اور تمہیں اپنے ہم سائے سے محبت کرنی چاہیے''۔ (متی، ۱۹:۱۹)

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا:

''تم اپنے ہم سائے سے اسی طرح محبت کرو جس طرح اپنے آپ سے محبت کرتے ہو''۔ (متی، ۳۹:۲۲)

لوقا کی انجیل میں اسی بات کو بہت زور دے کر کہا گیا ہے:

''لیکن آدمی نے بتانا چاہا کہ وہ اس کا سوال پوچھنے میں سیدھا ہے۔ اس لیے اس نے یسوع سے پوچھا کہ میرا پڑوسی کون ہے؟ تب یسوع نے کہا: ایک آدمی یروشلم سے یریحو کے راستہ میں جا رہا تھا کہ چند ڈاکوں نے اسے گھیر لیا۔اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اس کو بہت زیادہ پیٹا بھی۔اس کی یہ حالت ہوئی کہ وہ نیم مردہ ہو گیا۔وہ ڈاکو اس کو وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسا ہوا کہ ایک یہودی کاہن اس راہ سے گزر رہا تھا۔وہ کاہن اس آدمی کو دیکھنے کے باوجود اس کی کسی بھی قسم کی مدد کیے بغیر اپنے سفر پر آگے روانہ ہوا۔تب لاوی اسی راہ پر سے گزرتے ہوئے اس کے قریب آیا۔وہ بھی اس زخمی آدمی کی کچھ بغیر مدد کیے اپنے سفر پر آگے بڑھ گیا۔پھر ایسا ہوا کہ ایک سامری، جو اس راستے پر سفر کرتے ہوئے اس جگہ پر آیا، وہ راہ پر پڑے ہوئے زخمی آدمی کو دیکھتے ہوئے بہت دکھی ہوا۔سامری نے اس کے قریب جا کر

اس کے زخموں پر زیتون کا تیل اور مے لگا کر کپڑے سے باندھ دیا۔ وہ سامری چوں کہ ایک گدھے پر سواری کرتے ہوئے بذریعے سفر وہاں پہنچا تھا، اس نے زخمی آدمی کو اپنے گدھے پر بٹھایا اور اس کو ایک سرائے میں لے گیا اور اس کا علاج کیا۔ دوسرے دن اس سامری نے دو چاندی کے سکے لیے اور اس کو سرائے والے کو دے کر کہا کہ اس زخمی آدمی کی دیکھ بھال کرنا۔ اگر کچھ مزید اخراجات ہوں تو پھر جب میں دوبارہ آؤں گا تو تجھ کو ادا کروں گا۔ یسوع نے پوچھا کہ ان تینوں آدمیوں میں سے کس نے ڈاکو کے ہاتھ میں پڑے آدمی کا پڑوسی ہونا ثابت کیا ہے؟'۔ (لوقا، ۱۰:۲۹۔۳۶)

گویا اہم بات کسی شخص کا ہم سایہ ہونا ہے، نہ کہ اس کی قومیت یا مذہب۔ دوسرا کردار اس کہانی میں ایک پادری کا تھا جو اس یہودی کے پاس سے حقارت سے گزر گیا۔ تیسرا کردار ایک مربی کا ہے، جس نے ایک آدمی کو یوں پڑا دیکھا اور گزر گیا۔ چوتھا کردار ایک سامری کا ہے، جو کہ یہودی مذہب کے نزدیک ملحد تھا۔ اس نے انسانی ہم دردی اور بھائی چارے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مرتے ہوئے یہودی کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اس زخمی اور خستہ حال یہودی کی مرہم پٹی کی، پھر اس کو اپنے گھوڑے پر سوار کیا اور ایک سرائے میں لے جا کر اس کی مزید مدد کی۔ اس واقعہ میں سیدنا عیسیٰؑ نے یہ پیغام دیا ہے کہ ہم سایہ محض وہ شخص نہیں ہوتا جو آپ کے برابر میں رہتا ہے، یا جس کا تعلق آپ کے قبیلے اور ملک سے ہوتا ہے، بلکہ ہم سایہ ہر وہ شخص ہے جو آپ کے ساتھ بغیر مذہبی، نسلی اور اخلاقی تعلق کے بھی وابستہ ہو چکا ہے۔ صاحب تفسیر الکتاب لکھتے ہیں:

> ''سامری نے سارے انسانوں کا احترام کرنا سیکھا تھا، اس لیے وہ اس پر ترس کھاتا ہے جس طرح وہ چاہتا ہے کہ ایسی حالت میں مجھ پر ترس کھایا جائے۔ اس سامری کا ترس کوئی بے عمل ترس نہ تھا۔ اس نے صرف اپنا دل ہی نہیں بڑھایا، بلکہ اس بے کس زخمی آدمی کی مدد کے لیے اپنا ہاتھ بھی بڑھایا دیکھئے کہ یہ سامری کیسا ہم درد ہے۔ وہ زخمی آدمی کے پاس آیا۔ کاہن اور لاوی اس سے دور دور رہے تھے۔ اس وقت کوئی ڈاکٹر کوئی جراح نہیں مل سکتا تھا، اس لیے اس سامری نے خود یہ کام کیا۔'' ۲۔

سیدنا عیسیٰؑ نے جس دور میں ہم سایوں کے ساتھ محبت کرنے کا درس دیا، اس دور میں پادریوں کے نزدیک ہم سایہ صرف خونی رشتے والے شخص کو سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے اس کا وسیع تصور پیش کیا اور اس کا مطلب یہ بتایا کہ اس کی آڑے وقت میں امداد کی جائے، اس کی ضروریات پوری کی جائیں، اس کی کوتاہیوں سے درگزر کیا جائے، اس کا دکھ درد بانٹا جائے اور اس کا بوجھ ہلکا کیا جائے۔ یہ خدمت کا ایک ایسا انداز اور رویہ ہے، جو اپنے اندر بہت اثر رکھتا ہے۔

دشمنوں سے محبت

حضرت عیسیٰؑ نے دشمنوں سے بھی محبت کرنے کا سبق دیا ہے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک جب تک ہم حقیقی طور پر اپنے دشمنوں کے ساتھ محبت کرنا نہیں سیکھ لیتے، تب تک کرۂ ارض فساد کا منظر پیش کرتی رہے گی۔ لوقا کی انجیل میں ہے:

> ''اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارا کیا احسان ہے؟ کیوں کہ گنہ گار بھی اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اگر تم ان ہی کا بھلا کرو جو تمہارا بھلا کریں تو تمہارا کیا احسان ہے؟ کیوں کہ گنہ گار بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور اگر تم ان ہی کو قرض دو جن سے وصول ہونے کی امید رکھتے ہو تو تمہارا کیا احسان ہے؟ گنہ گار بھی گنہ گاروں کو قرض دیتے ہیں، تاکہ پورا وصول کرلیں۔ مگر تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور بھلا کرو اور بغیر نا امید ہوئے قرض دو تو تمہارا اجر بڑا ہوگا اور تم خدا تعالیٰ کے بیٹے ٹھہرو گے، کیوں کہ وہ ناشکروں اور بدوں پر بھی مہربان ہے۔ جیسا تمہارا باپ رحیم ہے، تم بھی رحم دل ہو۔'' (لوقا، ۶:۳۲۔۳۶)

آپؑ کے پہاڑی کے وعظ میں بہت سے بنیادی اور سماجی ضوابط موجود تھے۔ ان میں سے چند مشہور اقوال درج ذیل ہیں:

> ''لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ تم کسی پر غصّہ نہ کرو۔ ہر ایک تمہارا بھائی ہے۔ اگر تم دوسروں پر غصہ کرو گے تو تمہارا فیصلہ ہوگا اور اگر تم کسی کو برا کہو گے تو تم سے یہودیوں کی عدالت میں چارہ جوئی ہوگی۔ اگر تم کسی کو نادان یا اُجڈ کے نام سے پکارو گے تو دوزخ کی آگ کے مستحق ہوگے...... زنا نہ کرو..... کسی کو ہلاک نہ کرو- اگر تم زنا نہیں کرتے ہو، لیکن کسی کو ہلاک کرتے ہو، تب تم خدا کی شریعت کو توڑ نے والے ٹھہرے۔'' (یعقوب، ۲:۱۱)

ایک اور خطبے میں سیدنا عیسیٰؑ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''میں تمہیں جو کہتا ہوں اسے خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ تم اپنے دشمنوں سے پیار کرو۔ جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور جو

تمہیں گزند پہنچاتا ہے تم اس کے لیے دعا کرو‘‘۔(متی، ۵:۴۴)

ایک جگہ یوں حکم ہوا ہے:

’’بلکہ تم اپنے دشمنوں کے ساتھ محبت کرو اور ان کو بغیر واپسی کی امید کے قرض دے دو‘‘۔(لوقا، ۶:۳۵)

اس حکم نامے میں سیدنا مسیحؑ نے یہ وضاحت فرمادی ہے کہ حقیقی محبت کرنے والا بغیر کسی امید کے محبت کرتا ہے۔ ہم طبعی طور پر سچے پیار کو جانتے ہیں۔ اگر ہم اس کو پاسکیں تو ہم اسے خدا سے حاصل کر سکتے ہیں، اپنے والدین سے اور اپنے انتہائی قریبی دوست سے بھی۔ اگرچہ یہ مسلسل نہیں ہوتا، مگر ہمیں اس کا تجربہ ضرور ہو جاتا ہے اور ہمیں اس بات کی چنداں حاجت نہیں رہ جاتی کہ ہم سچے پیار اور جھوٹے پیار میں فرق بتائیں، جو محبت ہی کے نام پر کیا جاتا ہے، مگر بغیر کسی روحانی و مسیحائی محرک کے۔ عملی محبت ہی ہے جو مسیحؑ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ کریں۔ یہی ایک اصول ہے جس کے ذریعے ہم ربانی محبت اور پیغام کو اپنے دشمنوں سے اچھے برتاؤ کے ساتھ عام کر سکتے ہیں۔

عفو و درگزر

انجیل اس بات پر بہت زور دیتی ہے کہ دوسرے انسانوں کی کوتاہیوں سے درگزر کیا جائے۔ اگرچہ معافی کوئی آسان بات نہیں ہے، کیوں کہ کسی کی زیادتی کو محض ایک لفظ ’معافی‘ سے نہیں بھلایا جاسکتا، چنانچہ دوسروں کو معاف کر دینا بڑا ہی بلند ہمت کام ہے۔ ہمیں ضرور عفو و درگزر سے ایسے معاملات کو حل کرنا سیکھنا ہوگا۔ انجیل میں اس سلسلے کی صریح تعلیمات ملتی ہیں:

’’اور جس طرح ہم نے اپنے قرض داروں کو معاف کیا ہے تو بھی ہمارے قرض ہمیں معاف کر......اور ہمارے گناہ معاف کر، کیوں کہ ہم بھی اپنے قرض دار کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں نہ لا‘‘۔(متی، ۶: ۱۲، لوقا، ۱۱:۴)

’’اگر تم دوسرے لوگوں کی کوتاہیاں معاف کر دو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہاری غلطیاں معاف فرمادے گا۔ لیکن اگر تم لوگوں کی غلطیاں معاف نہیں کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہاری خطائیں معاف نہیں کرے گا‘‘۔(متی، ۶:۱۴-۱۵)

’’تب پطرس اوپر آیا اور اپنے آقا سے کہا! اگر میرا بھائی میرے خلاف برائی کرے تو میں کتنی مرتبہ اسے معاف کروں؟ کیا اسے سات دفعہ معاف کر دوں؟ تب مسیحؑ نے اسے جواب دیا، بلکہ تو اسے ستر بار معاف کر دے، میں تمہیں سات دفعہ نہیں، بلکہ ستر دفعہ معاف کرنے کا حکم دیتا ہوں‘‘۔(لوقا، ۱۷:۴)

’’اور ایک دوسرے پر مہربان اور نرم دل ہو اور جس طرح خدا نے مسیح میں تمہارے قصور معاف کیے ہیں، تم بھی ایک دوسرے کے قصور معاف کرو‘‘۔(افسیوں، ۴:۳۲)

’’پس جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی ان کے ساتھ کرو، کیوں کہ توریت اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے‘‘۔(متی، ۷:۱۲)

’’اگر تیرا بھائی تیرا گناہ کرے تو جا اور خلوت میں بات چیت کر کے اسے سمجھا۔ اگر وہ تیری سنے تو تُو نے اپنے بھائی کو پالیا۔ اور اگر نہ سُنے تو ایک دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جا، تا کہ ہر ایک بات دو تین گواہوں کی زبان سے ثابت ہو جائے۔ اگر وہ ان کی سننے سے بھی انکار کرے تو کلیسیا سے کہہ اور اگر کلیسیا کی سننے سے بھی انکار کر تو تُو اسے غیر قوم والے اور محصول لینے والے کے برابر جان۔۔۔ خبردار رہو! اگر تیرا بھائی گناہ کرے تو اسے ملامت کر۔ اگر توبہ کرے تو اسے معاف کر۔ اور اگر وہ ایک دن میں سات دفعہ تیرا گناہ کرے اور ساتوں دفعہ تیرے پاس پھر آ کر کہے کہ توبہ کرتا ہوں تو اسے معاف کر‘‘۔(متی، ۱۸:۲۱)

مزاحمت اور تشدد سے اجتناب

عیسائیت پر عمل کرنے والے کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ انجیل جناب عیسیٰؑ کی سیرت اور خدمتِ انسانیت کا پرتو ہے کہ آپ کی ساری زندگی تشدد اور

انجیل اس بات پر بہت زور دیتی ہے کہ دوسرے انسانوں کی کوتاہیوں سے درگزر کیا جائے۔ اگرچہ معافی کوئی آسان بات نہیں ہے، کیوں کہ کسی کی زیادتی کو محض ایک لفظ ’معافی‘ سے نہیں بھلایا جا سکتا، چنانچہ دوسروں کو معاف کر دینا بڑا ہی بلند ہمت کام ہے۔

مزاحمت سے پاک تھی۔ عیسائیت کی پہلی صدی عدم تشدد کی واضح مثال ہے جس کی بنیاد دراصل سیدنا عیسیٰؑ کی تشدد سے پاک ان تعلیمات پر تھی:

''میں تمھیں تمہارے دشمنوں کے ساتھ محبت کا سلوک کرنے کی تلقین کرتا ہوں اور ان کے لیے دعا کرنے کو کہتا ہوں جو تمھیں کوئی تکلیف دیتا ہے''۔ (متی، ۵:۴۴)

انجیل متقاضی ہے اس بات کی کہ ہر عیسائی کو امن کا علم بردار ہونا چاہئے۔ اسے دنیا میں امن کے دیرپا قیام کی کوششوں سے بخوبی آگاہ ہونا چاہئے اور اس کی تشکیل کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہئے۔ سیدنا مسیح کی تعلیمات کے مطابق ایسا رویہ اختیار کر کے ہی کوئی سچا مسیحی بن سکتا ہے۔

امن پسندی

مسیحیوں میں 'امن پسند' تحریک ابتداء ہی سے بہت مقبول رہی ہے۔ یہ ایک عیسائی کو جنگ میں شرکت سے روکتی ہے۔ ابتدائی دور کے رومن حکمرانوں کے ہاں عیسائی سپاہیوں کے شواہد بالکل نہیں ملتے۔ چرچ عیسائیوں کو جنگ و جدل سے روکتا ہے اور اس قسم کی سرگرمیوں سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ ابتدائی عیسائی ادب میں بھی اس قسم کی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی تحریر نہیں ملتی۔ مسیحی تعلیمات، جیسے ''دشمن سے محبت کریں''، کسی کو قتل نہ کریں'' اور ''اگر کوئی ایک طمانچہ مارے تو اپنا دوسرا گال اسے پیش کر دیں'' اس تحریک کے ابتدائی حوالے ہیں۔ ایک بڑی مثال یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی گرفتاری کے وقت اپنے ساتھی پطرس اور باقی حواریوں سے اپنے دفاع کے لیے مدد نہیں مانگی۔

دوسری صدی کی دستاویزات، جو اسکندریہ کے چرچ سے لی گئی ہیں، Apostalic Tradition کے نام سے موسوم ہیں، وہ امن پسند تحریک کی وکالت کے لیے بہت مشہور ہیں۔ ان میں یہ حکم ملتا ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں تلوار ہے اسے چاہیے کہ وہ پھینک دے اور جو سپہ گری کا پیشہ اختیار کرتا ہے وہ خدا سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ چوتھی صدی تک اس طرح کی تعلیمات عیسائیوں میں غالب رہی ہیں ''کہ میں سپاہی نہیں بنوں گا۔ میں گناہ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا، کیوں کہ میں ایک عیسائی ہوں۔''۔ مسیحی تاریخ میں 'سینٹ مارٹین' کو عیسائیت قبول کرنے کے بعد سپہ گری چھوڑنے پر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں عصر حاضر میں بھی ملتی ہیں۔ ۳؎

خدمتِ انسانیت

انجیل مقدس میں جابجا اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ سیدنا عیسیٰؑ نے کیا عمل کر کے دکھایا۔ ان کے معجزاتِ مسیحائی، ان کا دوسروں کی مدد

کے لیے بھاگ دوڑ کرنا، غریبوں کی دل جوئی کرنا، عاجزی و انکساری، خلوص و مسکنت اور ستائش سے بے نیاز ہو کر خدمتِ انسانیت، یہ تمام چیزیں مشعلِ راہ ہیں۔ انجیل کی مندرجہ ذیل آیات میں خدمتِ انسانیت پر بہت زور دیا گیا ہے:

''بلاشبہ انسان دوسروں کی خدمت کے لیے بھیجا گیا تھا، نہ کہ اس لیے کہ دوسرے اس کی خدمت کریں۔ تم میں سے عظیم وہ ہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں۔ جو خود کو بلند کرنے کی کوشش کرے گا وہ پست کر دیا جائے گا اور جو اپنے آپ کو پست رکھے گا اسے بلند کر دیا جائے گا۔ خداوند کے سامنے اپنے آپ کو عاجز بنو، پھر وہ تمھیں سربلند کرے گا''۔ (یعقوب، ۴:۱۰)

''سب سے بہترین تم غریب لوگ ہو، خدائی سلطنت تمہاری ہے، سب سے بہترین تم بھوکے لوگ ہو، تمھیں ضرور کھلایا جائے گا، سب سے بہترین تم رونے والے لوگ ہو، تمھیں ضرور ہنسایا جائے گا''۔ (لوقا، ۶:۲۰-۲۱)

''تمہارا خدا ہم سب کا معلم ہے۔ اس نے اور میں نے تمہارے پاؤں دھوئے ہیں تو تمھیں بھی چاہئے کہ تم دوسروں کے پاؤں دھودو۔ سو میں تمھیں اپنی مثال دے چکا ہوں۔ تمھیں چاہئے کہ تم بھی اب وہی کرو جو میں نے تمھیں کر دکھایا ہے''۔ (یوحنا، ۱۳:۱۴)

جناب مسیح نے اپنا بیش تر وقت نادار لوگوں کی مدد کرنے میں گزارا۔ انہوں نے ان لوگوں کی مسیحائی کی جو بیمار تھے۔ انھوں نے اکثر گناہ گاروں اور بھتہ خوروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا، جن کو معاشرے میں بہت برا سمجھا جاتا تھا۔

سیدنا مسیح کی تعلیمات کی پیروی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلا جائے، غریبوں کی امداد کی جائے، محبت والے کام کیے جائیں، مصیبت زدہ اور روتی بلکتی انسانیت کی مدد کی جائے۔ کسی غریب کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے، کسی جاہل سے نفرت نہ کی جائے، معذور اور ضرورت مند انسانوں کی ہر ممکن طریقے مدد کی جائے۔

قانون کا احترام

سیدنا عیسیٰؑ سے پوچھا گیا کہ کیا ہم قیصر روم کو ٹیکس ادا کریں؟ سیدنا عیسیٰؑ نے جواب دیا: ''جو کچھ قیصر کا حصہ ہے وہ قیصر کو دیا جائے اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دیا جائے''۔ (متی، ۲۲:۱۷)

ایک مملکت کا اپنے شہریوں پر یقینی استحقاق ہوسکتا ہے۔ یہاں قیصر سے مراد وہ قوانین ہیں جو حکومت بناتی ہے۔ شہریوں کا فرض ہے کہ وہ ان قوانین کا احترام کریں۔ ٹیکس ادا کرنا اس کی ایک مثال ہے۔ ایک حکومت اپنے شہریوں کو مختلف سہولیات مہیا کرتی ہے، چنانچہ شہریوں کو چاہئے کہ وہ اس کے بدلے میں ٹیکس ادا کریں۔

البتہ بعض اوقات حالات کی مناسبت سے کچھ حدود و قیود ہو سکتی ہیں، جن میں رہ کر ایک حکومت اپنے شہریوں سے مطالبہ کر سکتی ہے۔ اسی طرح ''خدا کو دو'' دراصل اس بات کی وضاحت ہے کہ حکومت کی اطاعت کس حد تک کرنی ہوگی؟ کیوں کہ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق صرف خدا سے ہوتا ہے، جب کہ حقیقی بادشاہت صرف اسی کی ہے۔ سب سے اعلیٰ وفاداری صرف خدا کے ساتھ کی جائے، یہی عیسائیت کا درس ہے۔

تعلیمات مسیح سے عیسائیوں کا انحراف

حضرت عیسیٰؑ کی سادہ، پرامن اور فطری تعلیمات بلا شک وشبہ اسی وقت تک محفوظ رہیں جب تک سینٹ پال نے مسیحیت قبول نہ کرلی۔ ان سادہ تعلیمات میں اس قدر وضاحت نہ تھی جس کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سلجھائے جاسکتے۔ سینٹ پال کی جاہلی خرافات اور لغویات کی آمیزش نے مسیحیت کے سچے پیغام کی وہ خوف ناک تشریح کی جس سے بالآخر مسیحیت چند بے جان مراسم اور بے کیف عقائد کا نام ہی رہ گئی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی مشہور تصنیف 'انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر' میں لکھا ہے:

> 'چھٹی صدی میں مسیحیت کے احوال میں مشہور زمانہ عیسائی مورخ اور مترجم قرآن 'سیل' لکھتا ہے کہ مسیحیوں نے بزرگوں اور مسیح کے مجسموں کی پرستش میں اس حد تک غلو کیا کہ رومن کیتھولک عیسائی بھی ایسا نہ کر پائے تھے۔ اسی غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر نفس مذہب اور حکومتی مباحث ایسے ابھرے کہ بے نتیجہ اختلافات کی شورش نے پوری قوم کو الجھا کر اس طرح رکھ دیا کہ اس کا انجام بڑے خوں ریز جنگی معرکوں کی شکل میں سامنے آیا۔ مخالفینِ مذہب کو سزائیں اس حد تک دی گئیں کہ اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ متضاد مذہب کے پیروکار قیرس (cyrus) کی نیابتِ مصر کے دس سال کی تاریخ وحشیانہ سزاؤں اور لرزہ خیز مظالم کی داستانوں سے لبریز ہے''۔[۴]

ایک مشہور مسیحی مصنف رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

> ''پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی رہی، جو کہ تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی چلی جارہی تھی۔ اس دور کی وحشت و بربریت زمانہ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی ہوئی تھی، کیوں کہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی جس کے نشانات مٹ رہے تھے اور جس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی۔ وہ ممالک، جہاں پر تمدن برگ و بار لایا تھا اور گزشتہ زمانہ میں اپنی ترقی کو پہنچ چکا تھا، جیسے اٹلی، فرانس، مگر اب وہاں طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔[۵]

امن کا یہ قتل اور مسیحی تعلیمات کی کھلی تحریف عیسائیت کے لیے ایک بدنما داغ بن گئی۔ ●

حواشی و مراجع

۱۔ The Encyclopedia of Religion, 17,222

۲۔ میتھیو، ہینری کامنٹری، تفسیر الکتاب ۳ / ۷ ۵۳، چرچ فاونڈیشن سیمینار، لاہور، ۲۰۰۵ء

۳۔ perspectiive, P. 9Jacques E L, Voilence: Reflections from christan

۴۔ ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص42،43

۵۔ Brefault, Robert. The Making of Humanity .P 164

ہندومت ایک مطالعہ

محمد اشفاق عالم ندوی

ہندوستان ایک قدیم ملک ہے۔ دنیا کے جن خطوں میں انسانی تہذیب وتمدن نے آنکھیں کھولیں، ان میں ہندوستان بھی ہے۔ آثارِ قدیمہ، علم الانسان اور جغرافیائی تحقیقات نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اب تک انسانوں کی ایسی کوئی بھی جماعت نہیں رہی ہے جو مذہب سے بالکل عاری رہی ہو۔ خود ہندوستان بھی بڑے مذاہب کا منبع وسرچشمہ اور مختلف تہذیب وتمدن کی آماجگاہ رہا ہے۔ ہڑپا موہن جوداڑو کی کھدائی میں بعض ایسے آثار وقرائن دستیاب ہوئے ہیں، جن سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں آریوں کی آمد سے قبل دوسری تہذیبیں بھی تھیں، لیکن آریوں کی ہندوستان آمد کے بعد ویدک دھرم نے اپنے ماقبل تہذیب وتمدن کو مٹادیا اور اس نے نظامِ زندگی کا ایک جدید فلسفہ پیش کیا۔ ذات پات کے اس نظام نے ایک طبقہ کو بام عروج پر پہنچادیا اور دوسرے طبقات کو حاشیہ پر ڈال دیا۔ ہندومت کے طبقاتی کے ذریعہ عورتوں کا استحصال کیا، مختلف رسوم ورواج کے ذریعہ غرباء کے خون اور ان کے پسینہ سے کمائی ہوئی دولت سے برہمنیت نے خوب ترقی کی۔ اس مقالہ میں ہندو مت کے بعض اہم گوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

لفظ 'ہندو' کا مفہوم

قدیم ہندوستان (جس میں موجودہ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور افغانستان وغیرہ قدیم ہندوستان میں شمار ہوتا تھا) میں دریائے سندھ کے اس پار رہنے والے لوگوں کو جغرافیائی اعتبار سے ہندو کہا جاتا تھا ۔جس کا ثبوت ایران کا قدیم ترین مذہب زرتشتیت کی مقدس کتاب زنداوستا میں ملتا ہے۔ اس کتاب میں ایک جگہ hapta hindu کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ س فارسی زبان میں ہ سے بدل جاتا ہے۔ اصلاً وہ سنسکرت زبان کا sapta sindhu تھا، جو فارسی زبان میں hapta hindu ہوگیا۔ تاریخی اعتبار سے دریائے سندھ کا یہ علاقائی نام تھا جو کہ موجودہ پاکستان اور شمالی ہندوستان میں واقع ہے۔ ۳۲۶ ق م میں جب سکندر اعظم ہندوستان کو فتح کی غرض سے آیا تو اس وقت اس نے دریائے سندھ کے اس پار رہنے والے لوگوں کو جغرافیائی اعتبار indu یا indous کہا جو بعد میں india بن گیا۔

۱۳ ویں صدی عیسوی میں جنوبی ہندوستان کے دو بھائیوں 'ہری ہر' اور 'لکا' نے اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے ایک باشاہ کا تخت پلٹ دیا اور خود اس کی جگہ تخت نشین ہوگئے اور اپنا لقب ہندو رکھا۔ اس کے بعد مرہٹوں کے مشہور سردار شیواجی نے اپنی جماعت کے ساتھ مغلوں سے جنگ کی اور

انہوں نے ان جنگوں کا مقصد ہندوؤں کی حکومت قائم کرنا قرار دیا۔ سترہویں صدی کے آخر سے ہندوؤں نے اس لفظ کو باضابطہ طور پر اپنے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

'ہندوازم' کی تحقیق

سب سے پہلے ہندوازم کا لفظ راجہ رام رموہن رائے نے ۱۸۱۶ء میں سناتن دھرم کی جگہ استعمال کیا۔ پھر اس کے بعد ایک انگریز محقق John crawfurd کا ایک تحقیقی مقالے Asiatick Researches کے نام سے ۱۸۲۰ء میں منظر عام پر آیا۔ جس میں سناتن دھرم کے بجائے ہندوازم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ۱۸۲۸ء میں کئی انگریزی محققین نے اس لفظ کو سناتن دھرم کی جگہ استعمال کیا اور بالآخر ۱۸۵۸ء میں آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں اس لفظ کو شامل کیا گیا، اس کے بعد سے عام طور پر لوگ سناتن دھرم یا ویدک دھرم کے لیے ہندوازم کا لفظ استعمال کرنے لگے۔

قدیم ہندوستان میں آریوں کی آمد

آریوں کی آمد سے قبل سیاہ فام ہندوستان میں آباد تھے۔ جو گنگا اور سندھ کے سرسبز وشاداب میدانوں میں پھیلے ہوئے۔ یہ محض جنگلوں میں رہنے والے وحشی نہیں، بلکہ شہروں میں رہنے والے مہذب اور متمدن لوگ تھے۔ ۱۵۰۰ق م تا ۲۰۰۰ق م کے درمیانی عرصہ میں آریائی نسل سے تعلق رکھنے والے قبائل وسط ایشیاء سے ہندوستان آنا شرع ہوئے اور سب سے پہلے انہوں نے پنجاب پر حملہ کیا اور یہاں کے اصل باشندوں کو نکال باہر کیا چنانچہ وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور باقی غلام بنا لیے گئے۔

آریوں کا عقیدہ

آریہ قوم اپنے ابتدائی زمانے میں توحید پر قائم تھی۔ چنانچہ البیرونی نے اپنی کتاب تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ

''خدا کے متعلق ابتدائی زمانے میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ وہ واحد، غیر فانی ہے نہ اس کا کوئی آغاز ہے اور نہ اس کا کوئی انجام۔ وہ مختار مطلق اور قادر مطلق ہے، احکم الحاکمین اور رب ہے اور اپنی سلطانی میں لاثانی ہے نہ اس سے کوئی مشابہ ہے اور نہ وہ کسی کے مشابہ ہے''۔

جب آریہ ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہیں بت پرستوں سے واسطہ پڑا اور پھر رفتہ رفتہ وہ مرض لاعلاج میں مبتلا ہو گئے اور بت پرستی کا عام رواج ہو گیا اور یہیں سے ہندو دھرم کا آغاز ہوا۔

ہندومت میں خدا تصور

ہندومت کی مقدس کتابوں یعنی وید، اپنشد اور گیتا وغیرہ میں بعض جگہوں میں خدا کی وحدانیت اور بعض جگہوں میں شرک کا بھی تصور واضح طور پر ملتا ہے۔ چنانچہ رگ وید میں کل ۳۳ خداؤں کا تذکرہ ہے، ان میں سے گیارہ زمین کے دیوتا ہیں اور گیارہ آسمان کے اور گیارہ فضاء کے دیوتا ہیں۔ لیکن تاریک دور میں ہمیں ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کی پرستش کا سراغ ملتا ہے۔

اپنشدوں میں خدا کی وحدانیت کا تصور

چھاندوگیا اپنشد باب ۶ فصل ۲ مشق ۱ میں ہے کہ

''وہ صرف ایک ہی ہے بغیر کسی کے''۔

''شیویتاشواترا اپنشد باب ۶ مشق ۹ میں ہے کہ

''اسکے نہ ماں باپ ہیں اور نہ اس کا کوئی مالک وآقا ہے''

یجر وید کے سمہتا حصہ کے باب ۴۰ مشق ۸ میں یہ بات مذکور ہے کہ

''اس کا کوئی جسم نہیں ہے وہ خالص ہے''

یجر وید سمہتا حصہ کے باب ۴۰ مشق ۹ میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ

''وہ لوگ تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں جو سمبھوتی یعنی مخلوق اشیاء کی پرستش کرتے ہیں، مخلوق اشیاء جیسے میز، کرسی اور بت وغیرہ''

رگ وید باب ۱ مشق ۴۶ میں ہے کہ

''عارفین (پڑھے لکھے دینی پیشوا) ایک خدا کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں''

ہندو ویدانت کا برہما سوتر یہ ہے کہ

''برہما (بھگوان) ایک ہی ہے، دوسرا نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے، ذرا بھی نہیں ہے''

ہندومت میں شرک کا تصور

ہندومت میں ابتداء ہی سے توحید کے ساتھ ساتھ شرک بھی رہا ہے چنانچہ تمام ہندو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دیوی دیوتا بھی فعال اور موثر ہیں اور ان میں اکثر لوگ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ خدا تین ہیں برہما، وشنو اور شیو اور یہ تینوں مستقل بالذات ہیں۔ برہما خالق ہے جس نے تمام انسانوں اور اس دنیا کو بنایا۔ اور وہ اس عمل تخلیق کے بعد آسمانوں کے پیچھے چلا گیا۔ دوسرا وشنو ہے جو اس دنیا کے انتظام وانصرام کو دیکھتا ہے اور لوگوں کے ساتھ رحم وکرم کا معاملا کرتا ہے اور تیسرا اشیو ہے جو الوہی طاقت کے قہر وجلال کی تجسیم ہے اور وہی اس دنیا کو ختم کریگا۔

اسی طرح دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ ہندومت میں دیویوں کی بھی پرستش ہوتی ہے چنانچہ شیو کی بیوی پاربتی اور شیو کی شکتی کالی ماں اور تانترک فرقے کی دیوی بھیراویں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں اور بھوانی جرائم پیشہ لوگوں، قزاقوں اور ڈاکوؤں کا معبود رہی ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سارے دیویاں ہیں جیسے درگا، کمندا، یا چندا اور شیر اوالی وغیرہ۔

ویدوں کا ایک تعارف

وید سنسکرت لفظ ود سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے جاننا، سمجھنا، سوچنا، غور وفکر کرنا۔ وید کا لفظ خود ویدوں میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ بعد کے ہندو مفکرین نے ان کتابوں کے لئے وید کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا۔

وید اپنے جامع مفہوم کے لحاظ سے کسی خاص کتاب نام نہیں ہے بلکہ ایک مقدس اور وسیع ادب ہے جو تین ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ کا خیال کیا جاتا ہے درحقیقت یہ کہنا دشوار ہے کہ ان کی ابتدائی حصہ کب وجود میں آئے۔

۱۔ مکس ملر کا کا خیال ہے کہ ویدوں کا زمانہ ۱۲ سو سال قبل مسیح ہے۔

۲۔ ہیک کا قیاس ہے کہ دو ہزار چار سو سال قبل مسیح ہے۔

۳۔ بال گنگادھر تلک کے خیال میں ویدوں کا زمانہ چار ہزار سال قبل مسیح قرار دیا جاسکتا ہے۔

لیکن ان میں سے کوئی بھی قول قطعی طور پر صحیح نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ ایک نامعلوم قدیم زمانے سے وید روایتا چلے آرہے ہیں اور ان کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ وہ مقدس کلام ہیں جنہیں خدا نے رشیوں کو سکھائے ہیں۔

ویدوں کی ترویج واشاعت

جس وقت وید ظہور میں آئے اس وقت ہندوستان میں تحریر کا کوئی رواج نہیں تھا اس لئے یہ سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہا اور بعد میں ان کے جمع و تدوین کا کام ہوا۔

وید چار ہیں:

۱۔ رگ وید ۲۔ سام وید ۳۔ یجروید ۴۔ اتھر وید

۱۔ **رگ وید**: اس وید میں دس ہزار منتر یا مناجاتی گیت ہیں اور یہ مکمل طور پر نظموں پر مشتمل ہے جس میں ہندوؤں کے خداؤں کی تعریف اور ان کی بزرگی سے متعلق گیت جمع کئے گئے ہیں اور دیوتاؤں کو مخاطب کر کے ان سے دعائیں مانگی گئیں ہیں اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رگ وید تمام ویدوں میں سب سے قدیم اور پرانا ہے۔

۲۔ **یجروید**: یجروید کا معنی ہے رسومات کا علم۔ یہ رگ وید ہی سے ماخوذ ہے اور اس یگیہ کے گایا جاتا ہے لیکن اس کی ترتیب اس طرح ہے کہ وہ مختلف مذہبی قربانیوں کے وقت پڑھی جاتی ہے اور ان میں نظموں کی ترتیب ان دیوتاؤں کے لحاظ سے ہے جن کی اس میں تعریف کی گئی ہے مثلا پہلا نظم اگنی کی تعریف اور اس سے متعلق باتوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ **سام وید**: سام وید بجز چند نظموں کے رگ وید پر مشتمل ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ مقررہ راگوں میں یگیہ (قربانی) کے موقعوں پر گائے جائیں۔ اس لئے اس کی کوئی عملی آزاد قیمت نہیں ہے بلکہ اس کو بھجنوں کی کتاب بھی کہا جاسکتا ہے۔

۴۔ **اتھروید**: اس وید میں چھ ہزار منتر یا مناجاتی گیت ہیں اور تقریبا ایک ہزار دو سو منتر رگ وید سے ماخوذ ہیں اور اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تقریبا نصف حصہ نثر پر مشتمل ہے۔

اپنشد ایک تعارف

اپا نیچے، سامنے

نشد بیٹھنا

یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں نیچے بیٹھنا اور اس کا اصطلاحی معنی ہے گرو کے نزدیک بیٹھنا اور اس کے اپدیش کو پوری توجہ اور یکسوئی سے سننا۔

ڈیوسن کا خیال ہے کہ اس لفظ کا مطلب پوشیدہ تعلیم ہے جو پردہ راز میں دی جاتی ہے جس کا ثبوت خود اپنشدوں کی بہت سی عبارتوں میں بھی ملتا ہے۔

چنانچہ یہ تعلیم اسی شاگرد یا طالب علم کو دیا جاتا تھا جو اخلاق کے بلند مرتبہ پر فائز ہو اور ذہین اور دانشور ہو اور خود کو گرو کے سامنے اس کے سننے کا اہل ثابت کرے اور اس خصوصی توجہ کی وجہ یہ تھی کہ یہ کسی غیر اہل اور غیر مستحق کو نہ دی جائے تاکہ اس کا بے جا تصرف نہ ہوسکے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اپنشدوں کا زمانہ بہت قدیم ہے جن کے متعلق قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اسی زمانے کے ہیں نا ہی ان کے کسی مصنف کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ ہاں ان سب کو مہاتما گوتم بدھ سے قبل قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ اپنشد بالخصوص جو کافی ضخیم ہیں زیادہ تر مکالموں کے طرز میں ہیں۔ ان کا طریقہ استدلال فلسفیانہ کے بجائے شاعرانہ ہے اور یہ عام طور سے استعارہ اور کنایہ کے ذریعہ صداقت کا اظہار کرتے ہیں۔ طرز ادا میں

بہت سے حذف عبارت سے کام لیا گیا ہے اس لئے اس کی تفسیر کے لئے وہی شخص موزوں ہوسکتا ہے جو ان کمیوں کو با آسانی پورا کرسکے۔

اپنشدوں میں ابتدائی اور اہم ترین وہ ہیں جن کی تفسیر اور شرح آدی شنکرآچاریہ نے کی ہے۔

۱۔کین	1.kena
۲۔کٹھ	2.katha
۳۔پرشن	3.prashna
۴۔منڈک	4.mundaka
۵۔ماندوکیہ	5.mandukya
۶۔تیتریہ	6.taitiriya
۷۔ایتریہ	7.aitariya
۸۔چھاندگیہ	8.chadogya
۹۔برہدآرنیک	9.brihad aranya
۱۰۔ایمن	10.aimana

اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ الگ الگ اپنشد ایک دوسرے سے مضمون اور طرز بیان میں بہت مختلف ہیں۔ان میں سے بعض وحدتی اصول ذات پر زور دیتے ہیں اور بعض یوگ کے عمل پر زور دیتے ہیں۔بعض شیو یا وشنو کی پوجا پر زور دیتے ہیں اور انہی کے مطابق انکے نام پڑ گئے یہ سب تعداد میں کل ایک سو آٹھ (۱۰۸) ہیں۔

اپنشد کا فلسفہ:

اپنشدوں میں میں برہمن اور آتمن کے تین نظریات ملتے ہیں جو نہایت پیچیدہ اور دشوار ہیں لیکن ہم ان پیچیدگیوں سے پہلوتہی کرتے ہوئے آسان اور قابل فہم الفاظ میں انہیں بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) اپنشدوں میں جو پہلا نظریہ ملتا ہے وہ برہمن کا ہے یعنی وہ ایسی ذات ہے جو انسانی خیالات وتصورات اور الفاظ سے پرے ہے۔اس حقیقت کو انسانی ذہن و دماغ کے سانچے میں سمویا نہیں جا سکتا۔وہ لامحدود ہے۔

برہدآرنیک میں ہے کہ:

''وہ نہ یہ ہے اور نہ وہ ہے (نیتی نیتی) وہ ناقابل تصور ہے کیوں کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا وہ غیر متغیر ہے کیوں کہ اس میں تغیر نہیں ہوتا۔وہ غیر محسوس ہے کیوں کہ کوئی چیز اس کو چھو نہیں سکتی۔وہ نہ تلوار کی ضرب سے مارکھا سکتا ہے اور نہ کوئی چوٹ سہ سکتا ہے''۔

(۲) اپنشدوں میں دوسرا آتمن کا نظریہ ملتا ہے۔وہ ایک ایسا ابدی عنصر ہے جو انسان کی ذات میں موجود ہے اس میں کبھی بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ موت کے ساتھ فنا ہوتا ہے بلکہ وہ ایک ابدی عنصر ہے جو لافانی ہے۔

چندگیا اپنشد میں ہے کہ:

''ایک ابدی روح ہے جو پاک ہے اور جو بڑھاپے، موت، بھوک، پیاس اور غم سے بری ہے یہی آتمن ہے۔انسان کے اندر روح اور اس روح کی ہر خواہش حق ہے، یہی وہ روح ہے جس کو ہر قیمت پر ہم کو پالینا چاہیئے۔جس نے اپنی روح کو پالیا اور اس کی معرفت حاصل کرلی اس نے تمام دنیاؤں کو پالیا، اور اس کی تمام خواہشات پوری ہوگئیں''۔

(۳) تیسرا نظریہ وہ ہے جس میں برہمن اور آتمن دونوں کو باہم مترادف معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔چنانچہ اپنشدوں میں اس بات کی وضاحت میں ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ وہ ایک ہی حقیقت ہے جو کائنات میں بھی جاری وساری ہے اور خود انسان کے اندر بھی موجود ہے گویا کہ انسان کے اندر اور باہر ہر طرف ایک پاک اور لافانی عنصر ہی واحد حقیقت ہے جو ہر چیز کی بنیاد ہے۔

چندگیا اپنشد میں ہے کہ:

''ایک روشنی ہے جو دنیا کی تمام چیزوں سے پرے چمک رہی ہے، ہم سب سے پرے، آسمانوں سے پرے، بلند ترین آسمانوں سے پرے۔یہی روشنی ہے جو ہمارے دل میں بھی چمک رہی ہے۔''

رامائن اور مہابھارت کا زمانہ

تقریباً ۵۰۰ ق م تک ویدوں کا زمانہ ختم ہوجاتا ہے۔اس کے بعد سے لیکر ۲۰۰ء تک کے زمانہ کو رامائن اور مہابھارت کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔یہ دونوں رزمیہ نظموں پر مشتمل ہیں اور یہ ویدک عہد کے بعد کے ادوار کی معاشرتی، مذہبی، اور سیاسی صورتحال کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

مہابھارت ایک تعارف

مہابھارت ہندوستان کی دو طویل رزمیہ نظموں میں سے ایک ہے۔اس رزمیہ نظم کا مرکزی قصہ راجا بھرت کے اخلاف کوروں اور پانڈوں کے درمیان جنگ تخت نشینی ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں بہت سارے غیر متعلق قصے کہانیاں ہیں جو اس دور کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔
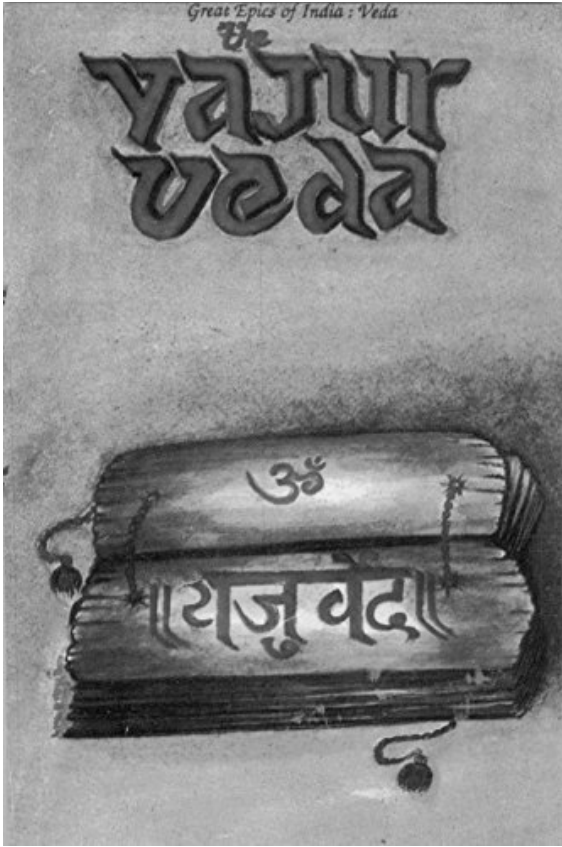
یہ جنگ اتنی بڑی تھی کہ اس کے آثار آریہ نسل کے ذہن وشعور پر مرتسم ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور اس کے بعد کے شعراء اور قصہ گویوں کے ذریعہ یہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہے اور چھٹی صدی قبل مسیح کے اختتام سے اس کی تدوین وتصنیف کا آغاز ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافے ہوتے رہے اور بالآخر صدیوں کے اضافے کے بعد تقریبا پانچویں صدی عیسوی میں اپنے تکمیل کو پہنچا۔ اس وقت اسکی موجودہ ضخامت ایک لاکھ اشعار پر مبنی ہے اور عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے مصنف ویدویاس جی ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مصنفین کا ایک سلسلہ ہے جنھوں اس کی تصنیف وتالیف میں حصہ لیا تھا اور بالآخر ویدویاس جی نے تقریبا چھ لاکھ اشعار میں سے ایک لاکھ اشعار پر مبنی مہابھارت کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا۔ مہابھارت میں ویدویاس جی کے کل چوبیس ہزار اشعار شامل ہیں۔

رامائن ایک تعارف

مہابھارت کے برخلاف رامائن ایک شخصیت رام چندر جی اور ان کے متعلقین کے اردگرد گھومتا ہے۔ مہابھارت کے مقابلے میں یہ ایک مہذب اور ترقی یافتہ معاشرہ کی عکاسی کرتا ہے۔

ان دونوں میں بنیادی اختلافات کے باوجود دونوں مذہبی عقائد ورسومات اور سماجی وسیاسی صورتحال اور ہندو مذہب کی ارتقاء کے ایک ہی دور کی داستان سناتے ہیں۔ یہی دونوں کتابیں ہیں جن میں ہندومت کے اہم فرقوں کے بارے میں کچھ بہت معلومات ملتے ہیں۔

بھگوت گیتا ایک تعارف

بھگوت گیتا مہابھارت کا ہی ایک حصہ ہے جو بھگوان شری کرشن جی کی فلسفیانہ وعظ ونصیحت پر مبنی ہے۔ یہ کتاب جو مہابھارت کے چھٹی کتاب کے اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب شری کرشن جی کی ان نصائح پر مشتمل ہے جو انہوں نے کورکشیتر کے میدان میں ارجن کو کیا تھا۔ جب ارجن کوروں کی فوج میں اپنے اعزہ واقرباء اور اپنے بچپن کے دوست واحباب کو دیکھتے ہیں تو ان کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ اس وقت شری کرشن جی جو ان کے رتھ بان کی حیثیت سے اس جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ رتھ کو دونوں فوجوں کے درمیان لے جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کی ہمت بندھاتے ہوئے ایک نصیحت کرتے ہیں۔ یہ پوری کتاب اسی وعظ ونصیحت پر مشتمل ہے۔

بھگوت گیتا کا فلسفہ اور اس کے اثرات

اس کتاب کے علاوہ ہندومت کی اکثر وبیشتر کتابوں میں ذات پات کا نظام اور ورنوں کا تصور ملتا ہے۔ جس میں صرف برہمن، چھتری اور ویش ہی مکش پراپت کرسکتے ہیں اور شودروں اور عورتوں کے لئے نجات اس وقت تک ممکن نہیں ہے۔ جب تک کے وہ مذکورہ بالا تین ورنوں میں سے کسی ایک میں پیدا نہ ہوں۔ لیکن بھگوت گیتا میں شری کرشن ارجن کے سامنے کرم کا ایک جدید فلسفہ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے عمل اور کام کے ذریعہ نجات حاصل کرسکتا ہے یعنی برہمن کا کام دیوتاؤں کے سامنے پوجا پاٹ کرنا اور غور وفکر کرنا ہے۔ چنانچہ اگر وہ بغیر کسی دنیاوی خواہش کے اس کام کو بحسن وخوبی انجام دیتا ہے تو وہ اس کے ذریعہ نجات (موکش) حاصل کرسکتا ہے۔

چھتریوں کا کام حکومت کرنا اور جنگیں لڑنا ہے چنانچہ اگر وہ بغیر کسی دنیاوی خواہش کے حکومت کرتے ہیں اور جنگیں لڑتے ہیں تو وہ اس کے ذریعہ نجات حاصل کرسکتے ہیں۔ اسی طرح ویش بھی اپنی تجارت وزراعت وغیرہ کے ذریعہ نجات حاصل کرسکتے ہیں۔ اور شودر مذکورہ بالا تینوں طبقوں کی خدمت کرکے اور انہیں خوش کرکے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔

اس کتاب نے ہندوازم کی احیاء وتجدید کا کام کیا اوران شودروں کو بھی جینے کا ایک مقصد عطا کیا۔ جو زندگی سے عاجز آچکے تھے۔ اس کتاب مذہبی کی اہمیت، مقبولیت اور ہندومت پر اس کے اثرات کے اعتبار سے ہندو روایت کی کوئی اور مقدس کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس کتاب کو شروتی (الہامی) تو خیال تو نہیں کیا جاتا ہے لیکن عملی اعتبار سے گیتا کو ویدوں سے کم اہمیت حاصل نہیں ہے۔ بھگوت گیتا ہندومت کی مقدس کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ بھگوت گیتا کو عوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ویدوں کو بھی نہیں ہوئی بلکہ وید ایک مخصوص طبقہ تک ہی محدود رہے۔

بھگوت گیتا ہندومت کی مقدس کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ بھگوت گیتا کو عوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ویدوں کو بھی نہیں ہوئی بلکہ وید ایک مخصوص طبقہ تک ہی محدود رہے۔

اسمرتیوں کا دور تدوین

اسمرتیوں کا زمانہ تصنیف ۱۰۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م کے درمیان ہے ہندو فقہی مسائل کی کتابوں میں یہ سب سے زیادہ منظم طور پر مرتب کیا گیا ہے اس لئے ہندو قانون کی کتابوں میں اسمرتیوں کو سب سے زیادہ بنیادی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کا زمانہ تدوین ۲۰۰ ق م سے ۲۰۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔

تمام اسمرتیاں تین حصوں پر مشتمل ہیں

(۱) آچار یعنی اس حصہ میں اخلاقیات اور معاملات سے بحث کیا گیا ہے۔

(۲) ویوہار: اس حصہ میں انسانی معاشرتی اوران میں پیش آنے والے مسائل جیسے جزاء وسزا کے قوانین مرتب کئے گئے ہیں۔

(۳) پرائشچت: اس حصہ میں جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہورہا ہے گناہوں سے توبہ وکفارہ سے متعلق مسائل کو یکجا کیا گیا ہے۔

ہندو قانون کی انفرادی اور معاشرتی زندگی کا یہ پورا نظام ورن آشرم دھرم پر مبنی ہے۔ اس لئے ہندو قانون سے متعارف ہونے کے لئے سب سے پہلے ورن آشرم دھرم کے متعلق جاننا ضروری ہے۔

ورن کے لغوی معنی رنگ کے ہیں اس لئے بعض مصنفین کہتے ہیں کہ ہندو سماج کو چار طبقہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں آریہ نسل سے تعلق رکھنے والے گورے رنگ اور خوبصورت ہوتے ہیں ان میں برہمن، چھتری اور ویش ہیں۔ جبکہ سماج کا چوتھا طبقہ جو کہ غیر آرین نسل سے ہیں وہ کالے اور چپٹی ناک والے شودر کہلاتے ہیں۔ ہندوستان پر مکمل قبضہ ہو جانے کے بعد آریوں نے یہاں کے باشندوں سے اپنے کو ممتاز رکھنے کے لئے ذات پات کا نظام بنایا اوراس میں یہاں کے باشندوں کو شودر کا درجہ دیا جس کا کام پہلے تین طبقوں کی خدمت کرنا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کے لئے بہت سارے کاموں کو ممنوع قرار دیا گیا مثلاً جینو پہننے کے حقدار صرف آریہ نسل سے تعلق رکھنے والے تینوں طبقات ہیں۔ اسی طرح ویدوں کی تعلیم حتی کہ ان کا سننا بھی ان پر حرام کردیا گیا۔ چنانچہ ویدانت میں یہ بات مذکور ہے کہ جو شودر ویدوں کا کوئی لفظ سن لے اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینا چاہئے۔

ورن یعنی ذات پات کے اس نظام کی ابتدا کے متعلق قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے البتہ ورنوں کا تصور ہمیں ویدوں میں ملتا ہے۔ چنانچہ رگ وید کا پرشا سکتا بھجن میں اس کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے۔

''اس (برھما) کے منھ سے برہمن پیدا ہوئے اوراس کے ہاتھوں سے چھتری پیدا ہوئے، جو راج کرتے ہیں، اس کی ٹانگوں سے ویش پیدا ہوئے جو اپنے کاروبار میں مشغول رہتے ہیں اور کم حیثیت غلام اسکے پیروں سے پیدا ہوئے۔''

بالآخر ذات پات کا یہ نظام رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ اور اسمرتیوں کے عہد تدوین تک اس میں اس قدر اضافہ ہوا کہ جس کی جھلکیاں آج بھی اسمرتیوں میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ اسمرتیوں اور خاص طور پر منو اسمرتی میں شودروں کو اس حد تک نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے گویا کہ وہ انسان کی نہیں بلکہ جانوروں کی نسل ہیں جو اس سرزمین میں آباد ہیں۔

ہندوازم میں فرقہ بندی کا زمانہ

رفتہ رفتہ جب ہندومت میں نئی نئی چیزیں در آئیں اور ذات پات کا نظام اس حد تک بڑھ گیا کہ شودروں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جانے لگا اور مذہبی عبادات اس حد تک پیچیدگی کا شکار ہوگئے کہ غریب کے لئے ان تمام پوجا پاٹ اور یگیہ وغیرہ کو انجام دینا مشکل ہوگیا تو لوگوں میں ہندومت سے بغاوت کی چنگاریاں اٹھنے لگیں اور دھیرے دھیرے لوگ برہمنوں کے خلاف اپنی زبانیں کھولنے لگے اور یہیں سے فرقہ بندی کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس مقالہ کے اندر ہم چند اہم فرقوں اوران کے عقائد سے بحث کریں گے۔

آجیوکا

اس فرقہ میں وہ لوگ تھے جو بے شمار خداؤں اوران کی پوجا پاٹ سے تنگ آچکے تھے چنانچہ انہوں نے سرے سے خدا کی ذات کا ہی انکار کردیا اور کرم یعنی عمل اور پوجا پاٹ وغیرہ کو بے اثر قرار دیا لیکن ان سب کے باوجود آواگون کی پذیرائی کی اوراس کی ایک نئی تشریح کی اور آواگون کا ایک جدید فلسفہ پیش کیا انہوں نے کہا کہ اس دنیا میں ایک کائناتی قانون ہے جس کو niyati کہا جاتا ہے اسی کے مطابق دنیا کا نظام چل رہا ہے اور انسان اپنے اچھے برے اثرات کی وجہ سے اس دنیا میں بار بار پیدا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کائناتی اصول اوراس کے قوانین ہی کچھ ایسے ہیں کہ انسان خود بخود پیدا ہوتا ہے۔اس فرقہ کے لیڈر مگھالی گھوشل کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

چارواک

اس فرقہ نے تو حد ہی کردی چنانچہ انہوں نے پورے ہندومت کو ہی باطل قرار دیا اور کہا کہ سارے لوگ برابر ہیں اس دنیا میں کوئی کسی سے بڑا نہیں اور نا ہی کوئی کسی سے چھوٹا ہوسکتا ہے اس دنیا میں روح ہی زندگی ہے۔ جب تک جسم میں جان باقی ہے عیش وعشرت اور مزہ اڑالو اس کے بعد کوئی زندگی نہیں اور نا ہی کوئی اس زندگی کا حساب کتاب کرنے والا ہے۔عمل اور کرم وغیرہ کا اس فرقہ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے اور آواگون اور خدا کے بھی منکر ہیں۔

نگنتھا

تیسرا فرقہ جو ہندومت میں وجود میں آیا وہ نگنتھا ہے اس فرقہ کے اکثر وبیشتر لوگ جنگلوں میں رہتے تھے اور ویدوں کی اہمیت وافادیت کے بالکل قائل نہیں تھے برہمنوں کے خلاف انہوں نے آواز بلند کی۔انہیں سماج کا ناسور قرار دیا اور یہیں سے ہندومت میں پوجا پاٹ اور یگیہ کو انجام دینے والے برہمن کو آستک اور خدا اور دیوتاؤں کے منکرین شرمن کو ناستک کہا جانے لگا۔

آستک برہمن سمسار یا سنسکار اور ویدوں کی قدامت اوران کے صداقت کے قائل تھے اور ساتھ ساتھ طبقاتی نظام، خدا کی ذات اور کرم وغیرہ کو بھی مانتے تھے۔ وہیں شرمن یعنی ناستک مذکورہ بالا تمام چیزوں سے اختلاف رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سارے اصول حتی کہ وید جس کے برہمن شروتی یعنی الہامی ہونے کے قائل ہیں یہ سب انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور ان کے ذہن ودماغ کی پیداوار ہیں۔

چنانچہ یہیں سے برہمن یعنی آستک فلسفہ کو ماننے والوں کے چھ مکاتب فکر (۱) سانکھیا، (۲) یوگ، (۳) ویدانت، (۴) ممانسا، (۵) نیائے، (۶) ویشیشکا وجود میں آئے۔

بھگتی تحریک

چوتھا فرقہ یا تحریک ہندومت میں بھگتی تحریک کے نام سے وجود میں آیا اور پورے جنوبی ہندوستان اور وسطی ہندوستان کے کچھ حصوں میں خوب پھلا پھولا۔اس فرقہ کی ابتداء ساتویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ چنانچہ جنوبی ہندوستان کے تمل ناڈو وغیرہ میں کچھ شعراء پیدا ہوئے جنہوں نے ذات پات کے نظام، قربانی اور مذہبی مراسم کو ڈھونگ قرار دیا اور ایک جدید فلسفہ پیش کیا کہ دنیا میں عقیدت ومحبت کا مرکز ایک خدا کو بناؤ، باقی ساری چیزیں انسانوں کی گڑھی ہوئی ہیں۔ان شعراء کو الور یا ازور شعراء کہا جاتا ہے، ان کی اکثر وبیشتر اشعار وشنو جی کی عقیدت پر مبنی ہیں۔اس فرقہ نے ایک خدا کی پرستش، مذہبی رسوم ورواج سے دوری اور عقیدت مندی اور خلوص نیت سے نجات کے حصول کی دعوت دی۔ان شعراء میں مرد کے ساتھ عورتیں بھی شامل تھیں۔

بھگتی تحریک میں خدا کا تصور

اس تحریک نے لوگوں کو بے شمار خداؤں اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا پاٹ اوران کے سامنے نذر ونیاز اور یگیہ وقربانی کی مخالفت کی دعوت دی اور اپنی پوری عقیدت مندی ایک خدا کے لئے خالص کرلینے اور اسی کی پرستش اوراس ایک خدا کی عقیدت ومحبت میں اپنی ذات کو فنا کردینے کی دعوت پیش کیا۔ یہ بھی کہا کہ مختلف ادیان ومذاہب میں اس ایک خدا کو مختلف نام اور مختلف اوصاف سے یاد کیا جاتا ہے چنانچہ اسے کہیں رام کہکر پکارا جاتا ہے تو کہیں اس کو رحیم کہکر یاد کیا جاتا ہے لیکن وہ صرف ایک ہے اس لئے خالص اسی کی پرستش کرو۔

اس فرقہ نے جہاں ایک خدا کے لئے اپنی عقیدت ومحبت خالص کرنے کی دعوت دی وہیں مورتی پوجا اوران کے لئے پوجا پاٹ اور یگیہ و قربانی کی بھی مخالفت کی۔

ہندومت اور اسلام کی مشترکہ باتیں

ہندوازم اور اسلام میں بہت زیادہ مماثلت تو نہیں ہے لیکن پھر بھی ہم ذیل میں ہندوازم اور اسلام کی چند مشترکہ باتیں تحریر کررہے ہیں۔

شراب کے تعلق سے منوسمرتی باب ۱۹ اشلوک ۵ ۲۳ میں ہے کہ

کسی دینی پیشوا کو مارنے والا، شراب پینے والا، چوری کرنے والا اور اپنے پیرومرشد کی بیوی سے ہم بستری کرنے والا، یہ سب کے سب اوران میں سے ہر ایک کو گناہ کبیرہ کا مرتکب خیال کیا جاتا ہے،،

منوسمرتی باب ۱۱ اشلوک ۹۴ میں یہ بات مذکور ہے کہ

چونکہ شراب ایک آلودہ کرنے والی گندگی ہے جسے چاول سے کشید کیا جاتا ہے اور گندگی شیطان کو کہا جاتا ہے اس لئے دینی پیشوا، حکمراں یا ایک عام شخص کو بھی شراب نہیں پینا چاہئے،،

اسی طرح ہندومت میں جوا بھی ایک فعل بد ہے اور اس فعل میں مبتلا شخص کو ویدوں اور منوسمرتی میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا ہے۔

رگ وید باب ۱۰ احمد ۳۴ اشلوک ۳ میں یہ بات مذکور ہے کہ

''ایک جواری کہتا ہے کہ میری بیوی مجھ سے دور رہتی ہے اور میری ماں مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ بدبختوں کو کوئی آرام پہنچانے والا نہیں ملتا،،

رگ وید میں ہی آگے ہے کہ

''جوامت کھیلو، بلکہ اپنی کھیتی کی زمین پر کاشتکاری کرو، پیداوار سے لطف اٹھاؤ اور اسی دولت پر قانع رہو،،

منوسمرتی باب ۷ اشلوک ۵۰ میں ہے کہ

''شراب پینا، جوا کھیلنا، عورتوں کیساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنا اور شکار کھیلنا، فطری خواہشات میں ان چاروں کو بد ترین تصور کرنا چاہئے،،

مذکورہ بالا منوسمرتی کے اقتباسات سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چوری اور بدکاری بھی ہندومت میں ایک مذموم عمل ہیں۔

اسلام کی نظر میں بھی شراب ایک گندی اور ناپاک چیز ہے جس سے انسان جسمانی اور ذہنی دونوں ہی قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے چنانچہ اسلام شراب اور جوا دونوں کو ہی حرام قرار دیتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

اے لوگوں جو ایمان لائے ہو شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے پرہیز کرو امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی،(المائدہ۔۹۰۔ پارہ۔۶)،

چوری کے تعلق سے قرآن کہتا ہے کہ

چور خواہ مرد ہو یا عورت دونوں ہی کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے،،(المائدہ۔۳۸۔ پارہ۶)

کسی عورت سے ناجائز تعلقات قائم کرنے اور اس کے ساتھ بغیر نکاح کے ہم بستری کرنے والے شخص کے سلسلے میں قرآن یہ سزا تجویز کرتا ہے کہ

''زنا کرنے والا خواہ مرد ہو یا عورت ان میں سے ہر ایک کو سوسو کوڑے لگائے جائیں گے،،(النور۔۲۔ پارہ۔۱۸)

ہندومت نے عورتوں کا بہت زیادہ استحصال کیا اس کے باوجود ہندومت کی مذہبی کتابوں میں عورت بطور ایک والدہ کے متعلق نہایت عمدہ تعلیمات ملتے ہیں۔

چنانچہ گوتم کا قول ہے کہ

''آچاریہ (وید پڑھانے والا استاد) اساتذہ میں سب سے بڑا ہوتا ہے مگر کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق ماتا ہی سب سے بڑی ہوتی ہے،،

آپستمب دھرم سوتر (۹/۱۸/۱۰/۱) میں یہ بات مذکور ہے کہ

''بیٹے کو چاہئے کہ وہ اپنی والدہ کی ہمیشہ خدمت کرے بھلے ہی وہ ذات سے خارج ہوگئی ہو، کیونکہ وہ اس کے لئے بے حد تکالیف برداشت کرتی ہے،،

مہابھارت شانتی پروا باب ۱۳ میں ہے کہ

''ماتا کے مثل کوئی چھایا نہیں ہے، ماتا کے مثل کوئی گتی (چال) نہیں ہے، (ماں کی طرح کوئی گناہ سے چھٹکارہ دلانے والا نہیں ہے) ماتا کے مثل کوئی محافظ نہیں ہے اور ماتا کے مثل کوئی محبوبہ بھی نہیں ہے،،

اسلام میں بھی بالکل اس ملتی جلتی تعلیمات موجود ہیں لیکن اسلام نے والدہ کے ساتھ ساتھ والد کے احترام اور اس کی خدمت گذاری کی بھی ترغیب دیتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تیرے رب نے فیصلہ کردیا کہ تم لوگ کسی کے عبادت نہ کرو مگر اسی کی اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی یا دونوں بوڑھے ہوکر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور یہ دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت اور شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔ (الاسراء۔۲۳۔۲۴ پارہ ۱۵)

لیکن احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ والدہ اپنی اولاد کے حسن سلوک کا زیادہ مستحق ہوتی ہے چنانچہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرے والدین میں میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تمہاری ماں۔ انہوں نے دوبارہ عرض کیا۔ آپ ﷺ نے دوبارہ ارشاد فرمایا۔ تمہاری ماں، اس صحابی نے تیسری بار عرض کیا تو آپ ﷺ نے تیسری بار بھی وہی جواب دیا کہ تمہاری ماں۔ چوتھی بار آپ نے

ارشاد فرمایا تمہارا باپ۔ (ریاض الصالحین۔ باب برالوالدین)

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

"الجنت تحت اقدام الامھات"

(الجامع الصغیر وزیادتہ)

یعنی جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے لہذا اس کی خدمت کر کے اپنے آپ کو جنت کا مستحق بنالو۔

ہندومت میں خدا تصور

ہندومت کی مقدس کتابوں یعنی وید، اپنشد اور گیتا وغیرہ میں بعض جگہوں میں خدا کی وحدانیت اور بعض جگہوں میں شرک کا بھی تصور واضح طور پر ملتا ہے۔ چنانچہ رگ وید میں کل ۳۳ خداؤں کا تذکرہ ہے ان میں سے گیارہ زمین کے دیوتا ہیں اور گیارہ آسمان کے اور گیارہ فضاء کے دیوتا ہیں۔

لیکن جو غیر مذہبی ہندو ہیں وہ ایک سے لیکر ۳۳ کروڑ خداؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ گویا کہ ایک غیر مذہبی ہندو کے نزدیک ہر چیز خدا ہے مثلا درخت، پہاڑ اور دریا وغیرہ

اپنشدوں میں خدا کی وحدانیت کا تصور

چھاندوگیا اپنشد باب ۶ فصل ۲ مشق ۱ میں ہے کہ

''وہ صرف ایک ہی ہے بغیر کسی کے،،

شیویتاشواترا اپنشد باب ۶ مشق ۹ میں ہے کہ

''اسکے نہ ماں باپ ہیں اور نہ اس کا کوئی مالک وآقا ہے،،

یجروید کے سمہتا حصہ کے باب ۴۰ مشق ۸ میں یہ بات مذکور ہے کہ

''اس کا کوئی جسم نہیں ہے وہ خالص ہے،،

یجروید سمہتا حصہ کے باب ۴۰ مشق ۹ میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ

''وہ لوگ تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں جو سمبھوتی یعنی مخلوق اشیاء کی پرستش کرتے ہیں مخلوق اشیاء جیسے میز، کرسی اور بت وغیرہ،،

رگ وید باب ۱ مشق ۴۶ میں ہے کہ

''عارفین (پڑھے لکھے دینی پیشوا) ایک خدا کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں،،

ہندو ویدانت کا برہما سوتر یہ ہے کہ

''برہما (بھگوان) ایک ہی ہے، دوسرا نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے، ذرا بھی نہیں ہے،،

ہندومت میں شرک کا تصور

ہندومت میں ابتداء ہی سے توحید کے ساتھ ساتھ شرک بھی رہا ہے چنانچہ تمام ہندو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دیوی دیوتا بھی فعال اور موثر ہیں اور ان میں اکثر لوگ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ خدا تین ہیں برہما، وشنو اور شیو اور یہ تینوں مستقل بالذات ہیں۔ برہما خالق ہے جس نے تمام انسانوں اور اس دنیا کو بنایا۔ اور وہ اس عمل تخلیق کے بعد آسمانوں کے پیچھے چلا گیا۔ دوسرا وشنو ہے جو اس دنیا کے انتظام وانصرام کو دیکھتا ہے اور لوگوں کے ساتھ رحم وکرم کا معاملا کرتا ہے اور تیسرا اشیو ہے جو الوہی طاقت کے قہر وجلال کی تجسیم ہے اور وہی اس دنیا کو ختم کریگا۔

اسی طرح دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ ہندومت میں دیویوں کی بھی پرستش ہوتی ہے چنانچہ شیو کی بیوی پاربتی اور شیو کی شکتی کالی ماں اور تانترک فرقے کی دیوی بھیراویں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں اور بھوانی جرائم پیشہ لوگوں، قزاقوں اور ڈاکوؤں کا معبود رہی ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سارے دیویاں ہیں جیسے درگا، کمندا، یا چندا اور شیرا والی وغیرہ۔

لیکن لیکن ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب کہتے ہیں کہ ہندومت کے علماء اور پنڈت اس بات کے قائل ہیں کہ خدا ایک ہی ہے اور ویدوں میں جو ۳۳ خداؤں کا تذکرہ ہے وہ درحقیقت مستقل بالذات خدا نہیں ہیں بلکہ وہ برہما کے ہی صفات ہیں۔

لیکن یہ بات میرے نزدیک صحیح نہیں ہے اور اسکی وجہ ہندومت میں شرک کا تصور کے عنوان کے تحت ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

اسلام کا تصور وحدانیت

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے اپنی وحدانیت کو سورہ اخلاص میں بہت ہی مختصر لیکن جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ فرماتا ہے۔

''اے نبی کہہ دو کہ اللہ ایک ہے، اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں نہ اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔''

(الاخلاص۔ پارہ ۳۰)

اسلام میں تصور وحدانیت کے سلسلے میں اس سورہ اخلاص کے بعد کسی اور دلیل اور حجت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے کیونکہ اس سورہ میں شرک کی تمام جڑیں کاٹ دی گئی ہیں اور بالکل واضح اور صاف وشفاف انداز میں یہ کہہ دیا گیا کہ اللہ تو صرف اور صرف ایک ہی ہے اس کے علاوہ اس دنیا کو پیدا کرنے والا اور اس کو چلانے والا کوئی بھی نہیں ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا کہ نہ تو وہ کسی کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور نا ہی کوئی اس کی اولاد

ہے۔ بلکہ وہ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہے۔اوراس کی ذات ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔

ہندومت میں آواگون کا عقیدہ اور اسلام

آواگون ہندومت کے بنیادی عقائد میں سے ایک ہے اسے پنر جنم بھی کہتے ہیں اس کے لغوی معنی بار بار جنم لینا اور مرنا ہے چنانچہ ہندوعقیدہ کے مطابق جب کوئی روح کسی انسانی قالب میں داخل ہوکر اس دنیا میں ایک بار آجاتی ہے تو وہ اپنے اچھے برے اثرات کی وجہ سے جنم مرن کے چکر میں جس آواگون کہتے ہیں پھنس جاتی ہے اور اس وقت تک اس کی نجات ممکن نہیں ہوتی جب تک وہ موکش پراپت نہ کرلے۔

اس عقیدہ کے مطابق انسان کے تمام اعمال خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے ان کے اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں اور جب انسان مرتا ہے تو وہ فنا نہیں ہوتا اور نا ہی کسی اور دنیا میں جاتا ہے بلکہ اسی دنیا میں کسی اور صورت میں پیدا ہوتا ہے اور اس پیدائش میں اس کے اعمال کے اثرات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنے اعمال کے برے اثرات کی وجہ سے کتا، سور یا کسی اور جانور کی شکل میں بھی پیدا ہوسکتا ہے۔

ہندومت کی کتابوں میں اس کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ روح کا انسانی جسم سے باہر نکلنے کے بعد چونکہ اس کے دوسرے انسانوں سے تعلقات کی بنیاد پر بہت سارے مطالبات اور معاملات باقی رہ جاتے ہیں جن کی ادائیگی کے لئے اور اپنے اعمال کے ثمرات کو پانے کی خاطر روح نئے روپ اور نئے قالب میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

جبکہ اسلام بالکل اس کے برعکس اپنا فلسفہ پیش کرتا ہے قرآن میں اللہ تعالی فرماتا ہے کہ کل نفس ذائقۃ الموت یعنی ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے ۔(آل عمران۔۱۸۵/ ۴) اس دنیا سے فنا ہوجانے کے بعد اللہ تعالی پوری انسانیت کو ایک بار پھر پیدا کریگا اوران کے اچھے برے اعمال کی جزاء وسزا عطا فرمائے گا۔اور اس دن کوئی کسی کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا قرآن کریم میں اللہ تعالی فرماتا ہے کہ اس دن کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے پکارے گا تو اس کی بوجھ کا ایک ادنی حصہ اٹھانے کے لئے بھی کوئی نہ آئے گا خواہ وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں (الفاطر ۔۱۸۔ پارہ ۲۲)۔

اس کے بعد تمام انسانیت کو ان کے اچھے برے اثرات واعمال کی بنا پر جنت وجہنم میں ڈال دیا جائیگا۔ یہ ابدالآباد زندگی ہوگی۔اس کے بعد کوئی زندگی نہیں۔اس دنیا میں انسان کی پیدائش کا مقصد قرآن کریم اللہ تعالی یہ فرماتا ہے: ہم نے انسان وجنات کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔(الذاریات۔۵۶ پارہ۔۲۸)۔

اس کا ایک دوسرا مقصد یہ بھی ہیکہ جس کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے۔اس نے موت اور زندگی کو اس لئے بنایا تاکہ وہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھ لے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔اور وہ زبردست بھی ہے۔اور درگزر فرمانے والا بھی۔(الملک۔۲۔ پارہ۔۲۹)

ہندومت میں ورنوں کا تصور اور اسلام کی تعلیم مساوات

آریوں کی ہندوستان آمد کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو یہاں کے سیاہ فام باشندوں سے الگ رکھنے کے لئے ذات پات کا نظام بنایا۔جس کی جھلکیاں ویدوں میں جابجا ملتی ہیں۔

چنانچہ رگ وید باب ۱۰ بھجن ۹۰ میں ہے کہ

> ''اس (برھما) کے منھ سے برہمن پیدا ہوئے۔اس ہاتھوں سے چھتری راجہ اور اس کی ٹانگوں سے عام آدمی یعنی ویش پیدا ہوا جو کاروبار میں مشغول رہتا ہے۔اور کم حیثیت غلام نے اس کے پیروں سے جنم لیا،،

مذکورہ بالا طبقاتی نظام کے وجود میں آجانے کے بعد معاشرہ میں ان کے کام اور ان کی ذمہ داریاں بھی تقسیم کردی گئیں چنانچہ ذیل میں ہم منوسمرتی سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جہاں ہر ورن اور ہر طبقہ کی ذمہ داریاں اور ان کے کام بتائے گئے ہیں۔

> ''اس پوری کائنات کی حفاظت اور استحکام کے لئے صاحب شان وشوکت پرش (ابتدائی دیوتا نما اساطیری انسان) نے ان ورنوں کو جو اس کے چہرے، ہاتھوں اور رانوں اور پیروں سے پیدا ہوئے تھے الگ الگ ذمہ داریاں سونپی''
>
> ''دوسروں کو تعلیم دینا، خود تعلیم حاصل کرنا، مذہبی ریت رسموں کو سرانجام دینا اور دوسروں کی اس سلسلے میں رہنمائی

کرنا، صدقات، عطیات دینا اور وصول کرنا، یہ ساری ذمہ داریاں اس نے برہمنوں کو سونپیں۔"

لوگوں کی حفاظت کرنا، صدقہ وخیرات کرنا، مذہبی رسومات کو سرانجام دینا، تعلیم حاصل کرنا اور خواہشات پر قابو رکھنا، یہ مختصراً ایک چھتری کی ذمہ داریاں ہیں۔

تعلیم حاصل کرنا، تجارت اور سوداگری کرنا، سود کا کاروبار کرنا، کھیتی کرنا، مویشی پالنا، مذہبی رسومات ادا کرنا اور صدقہ وخیرات کرنا یہ سب ایک ویش کی ذمہ داریاں ہیں۔

شودر کے لئے مالک نے صرف ایک ہی کام تجویز کیا ہے اور وہ یہ کہ وہ پورے خلوص سے تینوں اعلیٰ ذاتوں کی خدمت کرے،، (منوسمرتی باب ا اشلوک ۸۷۔۹۸)

اب ہم ذیل میں معاشرہ کے اندر صرف برہمنوں کو جو مخصوص مراعات حاصل تھیں، ان کے متعلق منوسمرتی کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

(۱) برہمن دوسرے تمام ورنوں کے لئے (پورے سماج) گرو کا کام کرے گا۔

(۲) برہمنوں کو کوئی جسمانی سزا نہیں دی جاسکتی۔

(۳) سڑکوں اور شاہراہوں پر ان کو خصوصی مراعات حاصل ہوں گی۔

(۴) کسی برہمن کو دھمکانا گناہ کبیرہ اور اس کی جان لینا سب سے بڑا گناہ ہے۔

(۵) کوئی کمتر ورن کا آدمی کسی برہمن پر دعویٰ نہیں کرسکتا۔

اس معاشرہ میں اس طرح کی اور بے شمار چیزیں تھیں جو صرف برہمنوں کو حاصل تھیں اور اس معاشرہ میں شودر کی کوئی اہمیت نہیں تھی بلکہ ان ساتھ غیر انسانی سلوک کرنا، اور ان سے جانوروں کی طرح کام لینا ایک عام بات تھی۔

اسلام کا تصور مساوات

لیکن اسلام نے مساوات اور اخوت و بھائی چارگی کی جو تعلیم دی ہے وہ تمام مذاہب سے بالکل مختلف ہے چنانچہ اللہ تعالی نے سورہ اخلاص میں فرمایا ہے: قل الله احد الله الصمد لم يلد ولم يولد لم يكن له كفوا احد (الاخلاص) یعنی اس سورہ کے ذریعہ اللہ تعالی نے اپنے واحد و یکتا ہونے اور تمام چیزوں سے اپنی بے نیازی کا اعلان کردیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ اس کی کوئی نسل نہیں جسے عظمت کی نگاہ سے دیکھی جائے اور اسے مخصوص مراعات دیے جائیں۔

آگے فرماتا ہی ہے: الم نخلقكم من ماء مهين وجعلناه في قرار مكين الى قدر معلوم فقدرنا فنعم القادرون (المرسلات۔۲۰۔ پارہ ۲۹) یعنی اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالی نے یہ بتادیا کہ شاہانہ خون کا دعوی ایک زعم باطل اور شاہانہ خون اور عامی خون کی تقسیم محض ایک افسانہ ہے پھر آگے مساوات کا درس دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم لوگوں کو ایک جان سے پیدا کیا (النساء۔ا۔ پارہ۔۴)۔ لہٰذا تم سب ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہوئے تم میں کوئی کسی سے حسب نسب، خوبصورتی، اور کالے گورے ہونے کے اعتبار بڑا نہیں ہوسکتا بلکہ تم میں سب سے باعزت اور مکرم وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار اور خدا سے ڈرنے والا ہو۔

(الحجرات۔۱۳۔ پارہ۔۲۶)

مذکورہ بالا آیات پر نبی آخرالزماں ﷺ عملی طور پر کاربند تھے چنانچہ ایک مرتبہ ایک مسلمان عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوکر آئی، قریش نے اس کی سفارش کی کہ اس کو سزا نہ دی جائے لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے لوگوں تم سے پہلی قومیں اس لئے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے تھے؟ خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ (الصحیح البخاری، کتاب الحدود)

ہندومت میں عورت کا مقام

ہندوستان میں آریوں کی آمد کے بعد ویدک دور شروع ہوتا ہے۔ بعد کے ادوار کے مقابلے میں اس دور میں عورتوں کی حالت کچھ بہتر تھی لیکن ویدک دور میں بھی بہت سے لوگوں نے عورتوں کی مخالفت میں آواز بلند کی اور ان کی توہین کی اور ان کے ساتھ نفرت کا برتاؤ کیا۔

چنانچہ رگ وید کے باب ۵ اشلوک ۹۳ میں ہے کہ

"عورتیں غلاموں (لونڈیوں) کی فوج اور اسلحہ اور اوزار ہیں،،

اسی طرح تیتریہ سمہتا کے باب ۱۶ اشلوک ۵ میں ہے کہ

"لہٰذا عوتیں بغیر قوت کی نحیف اور لاچار ہیں انہیں حق وراثت نہیں ملتا۔ وہ شریر سے بھی بڑھ کر بدتمیزی سے بات کرتی ہے،،

جب پرانوں کا دور آیا تو ظلم نسواں میں کچھ اور اضافہ ہوا چنانچہ مارکنڈیہ پران باب ۱۶ میں ہے کہ

''عورتوں کے لئے الگ سے یگیہ یعنی قربانی، شرادھ اور برت وفاقہ کا دستور نہیں ہے شوہر کی خدمت کے علاوہ ان کا کوئی دنیاوی فرض یا وجود نہیں ہے،،

رفتہ رفتہ یہ سلسلہ چلتا رہا اور ان پر ظلم وزیادتیاں ہوتی رہی ان پر بہت ساری اخلاقی الزامات بھی لگائے گئے۔ مہابھارت انشاسن پروا باب ٦ اشلوک ١٩ میں لکھا ہے کہ

''سوتر کار نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عورتیں جھوٹی ہوتی ہیں،،

''عورتوں سے بڑھ کر کوئی دوسرا شریر نہیں، یہ ایک ساتھ ہی استرہ کی دھار ہیں زہر ہیں اور اگنی ہیں،،

اس طرح کی اور بے شمار باتیں ہندومت کی مذہبی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن ہم ان سے صرف نظر کرتے ہوئے ہندومت میں رسم ستی کے متعلق کچھ باتیں قارئین کی نظر کرتے ہیں۔

تقریبا ١٨٢٩ء سے پہلے تک ہندوستان میں بیوہ عورتوں کا اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ ستی ہوجانا (جل کر مر جانا) ایک مذہبی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ رسم صرف براہمن میں ہی نہیں بلکہ راج گھرانوں اور اعلی ذات کے لوگوں میں بھی رائج تھا لیکن ہندومت کی مذہبی کتابوں میں اس سلسلہ میں کوئی خاص حکم موجود نہیں ہے۔

''وشنو دھرم سوتر باب ١٤ میں لکھا ہے کہ اپنے شوہر کی وفات پر بیوہ عورتیں برہم چریہ (عفت) رکھتی تھیں یا شوہر کی چتا پر ستی ہوجاتی تھیں،،

''مہابھارت کے آدی پروا میں ستی کے متعلق لکھا ہے کہ پانڈو کی پیاری رانی مادری نے شوہر کی لاش کے ساتھ اپنے کو جلا دیا،،

اسلام میں عورت کا مقام

قرآن کریم میں عورتوں کے تعلق سے اللہ تعالی فرماتا ہے: عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے (البقرہ ٢٢٨)

دوسری جگہ اللہ تعالی فرماتا ہے کہ یعنی وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ تم اس کے پاس سکون حاصل کرو (الاعراف۔١٨٩)

عمل کے معاملے میں عورت اور مرد دونوں یکساں ہیں چنانچہ جو جیسا کریگا اس کے مطابق اس کا اجر پائے گا، اس معاملے میں عورت اور مرد میں کوئی تفریق نہیں کیا جائے گا۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے

سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لئے اچھا ہو۔ حدیث کے مطابق بیوی کے اوپر شوہر کا سب سے زیادہ حق ہے مگر وہ اپنی بیوی کے لئے خدا کے مثل نہیں ہے اور نا ہی بیوی اس کی لونڈی ہے اسے ہر طرح کی عبادت کرنے کا حق ہے عبادت کے معاملے میں بیوی کے لئے شوہر سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسلام نے عورت کے بیوہ ہونے پر اس کو دوسری شادی کرنے کی بھی اجازت دیتا ہے اور ایک نئی زندگی جینے کی ترغیب دیتا ہے۔

کلمہ اختتامیہ

مطالعہ ادیان و مذاہب کے دو مقصد ہو سکتے ہیں چنانچہ ان میں سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے ایک مسلمان کا ایمان اپنے دین پر مزید راسخ ہو اور اسکا ثبوت حضرت عمرؓ کا ایک قول ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ جس نے جاہلیت کو دیکھا اور اس کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوا تو اس کا ایمان اور اس کا اسلام اس شخص کے مقابلے میں جس نے جاہلیت کی بداعمالیوں اور اس کی سختیوں کو نہیں دیکھا ہے زیادہ بہتر، مضبوط اور راسخ ہے۔ چنانچہ مطالعہ ادیان و مذاہب سے ہمارے دلوں میں اسلام کے دین یسر ہونے کا یقین بھی مضبوط ہوجاتا ہے اور دیگر ادیان و مذاہب میں عبادات ورسومات اور ان کے تصور نجات کے مطالعہ کے بعد اسلامی عبادات اور اس کے تصور نجات نہایت آسان اور ہلکے معلوم ہوتے ہیں۔ مطالعہ ادیان و مذاہب کا دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں مختلف ادیان و مذاہب اور نظریات کے ماننے والے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے ذریعہ سے ہم ان سے بہتر تعلقات قائم کر سکتے ہیں اور پر امن زندگی گذار سکتے ہیں۔

اس کا آخری اور سب سے بڑا مقصد تبلیغ دین ہے چنانچہ ہمیں اپنے آس پڑوس میں رہنے والے ہندو بھائیوں اور خاص طور پر ان لوگوں تک جو ادیان مذاہب کی چکی میں پیسے جا چکے ہیں اور جن پر ہر دا ور اور ہر زمانے میں ظلم و ناانصافی کو روا رکھا گیا ہے۔ ان تک اسلام کی تعلیمات کو عملی طور پر پہونچانے کی ضرورت ہے اور انہیں اسلام کے تصور مساوات، اسلام میں عبادات اور اس کے دین یسر ہونے کے دعوی سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے اور خود ہمیں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اور اپنے اخلاق و کردار کے ذریعہ ان ہندو بھائیوں کو مطمئن کرنے کی ضرورت ہے جو مسلمانوں سے خائف اور ڈرے ہوئے ہیں یا پھر اسلام سے بدگمان ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستان میں رہنے والے ہر ہندی تک اسلام کی پاکیزہ تعلیمات اور اس کے محکم اصولوں کو بحسن و خوبی پہونچائیں اور آج انہیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِندَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:۱۹) کہ اللہ کے نزدیک اگر کوئی دین ہے تو وہ اسلام ہے اسی پر عمل پیرا ہو کر اور اس کی تعلیمات کو دل و جاں سے لگا کر ہی نجات کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔

مراجع و مصادر

(1) who invented hinduism by david n. lorenze

(۲) دنیا کے بڑے مذہب — عمادالحسن آزاد فاروقی

(۳) ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقاء — اچ این سنہا (قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں)

(۴) مذاہب عالم ایک تقابلی مطالعہ — مولانا انیس احمد فلاحی

(۵) تقابل ادیان — مولانا محمد یوسف خان

(۶) ہندومت اول و دوم — خدابخش اورنٹیل لائبریری پٹنہ

(۷) کچھ ہندومت کے بارے میں — خدابخش لائبریری

(۸) ہندی فلسفہ کے عام اصول — شیو موہن لعل ماتھر

(۹) قدیم ہندی فلسفہ — شیو موہن لعل ماتھر

(۱۰) دبستان مذاہب — کیخسرو اسفندیار (تعلیقات رشید احمد جالندھری لاہور)

(۱۱) اسلام اور ہندو دھرم کی مشترکہ باتیں — ڈاکٹر ذاکر نائک

(۱۲) مذاہب میں عورت کا مقام — محمد یونس قریشی

(۱۳) ہندستانی مذاہب میں توحید رسالت اور آخرت کا تصور — روفیسر محمد مشتاق احمد تجاروی

(۱۴) گگن کا مذاہب نمبر — اڈیٹر شمس کنول

(۱۵) ہندو مذہب مطالعہ اور جائزہ — پروفیسر محسن عثمانی ندوی

(۱۶) ترجمۂ قرآن — مولانا مودودیؒ

(۱۷) صحیح بخاری، جلد دوم کتاب الحدود

(۱۸) اسلام میں عدل اجتماعی — سید قطب شہیدؒ

(۱۹) اسلام کا تصور مساوات — مولانا سلطان احمد اصلاحی

(۲۰) ریاض الصالحین۔ باب برالوالدین — الامام النووی

(۲۱) الجامع الصغیر و زیادتہ — علامہ ناصرالدین البانی

نظریہ وحدت ادیان کا جائزہ

(اسلامی تعلیمات کی روشنی میں)

رمیصاء مریم

وحدت ادیان سے اصطلاحی طور پر یہ مراد لیا جاتا ہے کہ تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی بزرگ و برتر ذات ہے، جسے مسلمان اللہ، ہندو ایشور اور انگریز گاڈ (God) کہتے ہیں۔ یہ مختلف مذاہب میں عبادت الٰہی کے مختلف طریقے پائے جاتے ہیں، اس بنا پر تمام انسانوں کو تمام مذاہب کا احترام کرنا چاہیے اور ان کے ماننے والوں سے حسن سلوک اور محبت رکھنی چاہیے۔ یہ بات کہنا درست نہیں ہے کہ آخرت میں نجات کسی ایک مذہب کی پیروی میں منحصر ہے۔

فلسفۂ وحدت ادیان کی جتنی بھی تعریفات کی گئی ہیں ان کا مرکزی خیال یہی ہے کہ تمام مذاہب یکساں اور برحق ہیں اور کسی بھی مذہب کی پیروی سے کائنات کے خالق کی رضا اور خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہر مذہب اس دنیا کے مالک حقیقی کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے، لہٰذا انسان کوئی بھی مذہب اختیار کرے، وہ جنت کا مستحق ہوگا۔ لہٰذا کسی ایک مذہب والوں (خصوصاً اہل اسلام) کا اس بات پر اصرار کہ اب تا قیامت نجات کی سبیل صرف ہمارے مذہب ہے، یہ (معاذ اللہ) ایک بے جا سختی اور تشدد یا انتہا پسندی ہے، جس کا خاتمہ ازحد ضروری ہے۔ ڈاکٹر احمد بن عبدالرحمن وحدت ادیان کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> و هوا الا عتقاد بصحة جميع المعتقدات الدينية، و صواب جميع العبادات، و انها طرق الى غاية واحدة[1]

یہ اعتقاد رکھنا کہ تمام مذاہب درست اور عبادتوں کے تمام طریقے ٹھیک ہیں اور وہ سب ایک ہی منزل تک پہنچانے والے الگ الگ راستے ہیں۔ بسام داؤد عجک کہتے ہیں:

> قضية وحدة الاديان التى ترى أن الأديان كلّها ذات أصول واحدة، و متفقة فى أهدا فها و عقائدها و شرائعها، فلا خلاف فى الحقيقة بين لأديان الا فى المظار و الطقوس والعبادات[2]

وحدت ادیان کے نظریہ کی بنیاد اس پر ہے کہ تمام ادیان ایک ہی اصول پر قائم ہیں، اور وہ اپنے اہداف، عقائد اور شرائع کے معاملے میں یکساں ہیں، ان کی بنیادی حقیقت ایک ہی ہے، بس ان کے ظاہری رسوم ورواج اور عبادت کے طریقے الگ الگ ہیں۔

وائی مسیح کی نظر میں وحدت ادیان کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

There is one religion of the supreme spirit, all othe religions are so many dialects of the same religion of the supreme spirit. ۳؎

مولانا وحید الدین خاں نے اس کی یہ تعریف کی ہے:

وحدت ادیان ایک مستقل نظریہ ہے۔ اس کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ تمام موجود مذاہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان میں جو فرق ہے، وہ اس کے ظاہری فارم (Form) کے اعتبار سے ہے اور یہ فرق اضافی (Relative) ہے، نہ کہ حقیقی (Real)۔ اس نظریے کے مطابق تمام موجود مذاہب سچے ہیں۔ ان میں جس مذاہب کو بھی آدمی اختیار کرے، وہ اس کے لیے نجات (Salvation) کا ذریعہ بن جائے گا۔ نجات کسی ایک مذہب کی اجارہ داری نہیں۔ ۴؎

مولانا سلطان احمد اصلاحی وحدت ادیان کی تمام تعریفوں کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

منزل ایک ہو تو راستوں کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمام مذاہب میں حق وانصاف کی خدمت، انسان دوستی اور انسانی بھائی چارے کی تعلیم دی گئی ہے: اس لیے تمام انسانوں کو تمام مذاہب کا یکساں ادب واحترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کسی مذہب کے پیروؤں کا یہ احساس کہ حق و صداقت تنہا انہی کے مذہب کے ساتھ ہے اور آخرت کی نجات کے لیے تنہا اسی مذہب کی پیروی ضروری ہے، مذہب کے سلسلے میں یہ بیجا تشدد اور سختی کا رویہ ہے، جس سے مختلف مذاہب کے درمیان پرامن بقائے باہم کے عظیم مقصد کو نقصان پہنچتا ہے۔ دانش مندی اور سمجھ داری کا راستہ یہ ہے کہ بے جا مذہبی تشدد کے راستے کو چھوڑ کر تمام مذاہب کا یکساں احترام اور یکساں طور پر ہر ایک کی صداقت وحقانیت کو تسلیم کیا جائے۔ تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی بزرگ وبرتر ذات ہے، جسے ناموں کے اختلاف خدا، بھگوان اور God مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مختلف مذاہب خدا کی بندگی اور اس کو خوش کرنے کے مختلف ذرائع ہیں۔ تمام مذاہب کا یکساں احترام اور ہر ایک کی یکساں صداقت کو تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ یہ ہے وحدت ادیان کے اس نظریے کا خلاصہ جس کا آج (آزاد ہندوستان میں) ہر جگہ چرچا ہے''۔ ۵؎

وحدت ادیان کے اس نظریہ کے متاثرین میں آج ایک کثیر گروہ شامل ہے، جن میں سے اکثریت کا تعلق ہندوستان کے علاقہ سے ہے۔ دانش وروں کا ایک قابل لحاظ طبقہ بھی اس فلسفہ کی صداقت وحقانیت کو تسلیم کرتا اور اپنے ذرائع سے اس کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو اس نظریہ کو راہ راست سمجھتے ہیں اور اس کے پرعزم داعی ہیں۔

وحدت ادیان کی اقسام

وحدت صغریٰ

اس سے مراد ہے ایسے تمام ادیان کو ایک دین میں شامل کرنا جو آسمانی ہیں، یعنی سامی ادیان کی وحدت، جن میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام شامل ہیں۔ محمد عبدالرحمن عوض اس کی وضاحت کچھ اس طرح کرتے ہیں:

وحدت ادیان صغری میں ان ادیان کو جمع کرنا مقصود ہے جن کا اختتام دین ابراہیمی پر ہوتا ہے۔ یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام۔ اسے وحدت ادیان سماوی کہا جاتا ہے۔ تینوں کے مجموعے کو الابراہیمیۃ کہا جاتا ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہے۔ ٦؎

ڈاکٹر خالد الجریسی لکھتے ہیں:

''وحدت ادیان سماوی سے مراد اسلام، یہودیت اور عیسائیت کو لیا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ تمام ادیان کے عبادت خانے بھی یونی ورسٹیوں، ہوائی اڈوں اور پبلک مقامات پر، ایک ہی احاطہ میں ہوں اور ایک ہی غلاف میں تورات، انجیل اور قرآن بھی ملفوف ہوں۔ ٧؎

وحدت ادیان کبری

اس سے مراد دنیا میں موجود تمام مذاہب اور نظریات کی وحدت ہے، ڈاکٹر احمد بن عبدالرحمن اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''اس وحدت میں تمام مذاہب حتی کہ بت پرست قوموں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ حتی کہ ملحدین بھی اس گروہ میں شامل کیے جاتے، کیونکہ بت پرست قومیں سابقہ انبیاء کی نشانیاں ہیں اور ملحد بھی انسانیت (Humanism) پر ایمان رکھتے ہیں۔ ٨؎

مترادف اصطلاحات

نظریہ وحدت ادیان کے لیے کئی اور اصطلاحات کو استعمال کیا جاتا ہے، مثلا!، توحید الادیان، توحید الادیان الثلاثہ، الابراھیمیۃ، الملۃ ابراھیمی،

وحدۃ دین الھی، المومنون، المومنون المتحدون، الناس متحدون، الدیانۃ العالمیۃ، التعایش بین الادیان، الملیون، العالمیۃ وتوحید الادیان ۹ے

فلسفۂ وحدت ادیان کی تاریخ

یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے اور نہ اس صدی کی پیداوار ہے، بلکہ ایک نظریہ اور آئیڈیالوجی کے طور پر اس کی جڑیں بہت قدیم ہیں، جو حالات اور واقعات کے مطابق اپنا رنگ ڈھنگ تبدیل کر کے نت نئے طریقوں سے سامنے آتی ہیں، شیخ بکر بن عبداللہ بن ابوزید لکھتے ہیں:

''یہ یہود و نصاریٰ کا نظریہ ہے، یہ محض اپنی علامات اور نشانیوں کی بنا پر نیا ہے، ہر جگہ مسلمانوں میں مکمل طور پر اس کی فکر سرایت کر چکی ہے، کیوں کہ اس کے ذریعے کوشش ہے کہ مسلمانوں سے اسلام کی دولت چھین لی جائے ورنہ فی الحقیقت یہ نظریہ قدیم ہے۔ یہود و نصاری کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہیں''۔ ۱۰ے

اگر اس نظریہ کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو اس کے منظر عام پر آنے، عوامی سطح پر پھیلاؤ اور اس کے اثرات کے اعتبار سے اس کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ شیخ بکر بن عبداللہ اور جناب مقصود الحسن فیضی نے اس کے وجود و ارتقاء کے چار مراحل بیان کیے ہیں:

۔ پہلا مرحلہ: عہد نبوی ﷺ

۔ دوسرا مرحلہ: تابعد زمانہ خیر القرون

۔ اوائل چودھویں صدی

۔ عصر حاضر ۱۱ے

اس ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے اور دیگر تاریخی ارتقاء کو پڑھتے ہوئے مختلف گروہوں اور اس فکر کے مؤیدین کے اعتبار سے اس نظریہ وحدت ادیان کے وجود و ارتقاء اور پھیلاؤ کا ایک اجمالی ساخاکہ ذیل میں بیان کیا جائے گا:

مشرکین مکہ

اس میں شک نہیں کہ سب سے پہلے مشرکین مکہ نے اسلام قبول کرنے والوں کے ساتھ ظلم و ستم اور تشدد کا راستہ اختیار کیا، لیکن جب اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو سودے بازی پر اتر آئے اور ''کچھ لو اور کچھ دو'' کے اصول کو اپنا کر اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔

سورۂ الکافرون کا سبب نزول تمام مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ: مشرکین مکہ نے نبی ﷺ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ ایک سال ہم آپ کے معبود (اللہ وحدہ لاشریک لہ) کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں، ہم حق پر ہوئے تو آپ کو بھی ایک حصہ حق کامل جائے گا اور ہمیں آپ کے دین حق میں سے ایک حصہ مل جائے گا وغیرہ۔ اس پر سورۂ الکافرون نازل ہوئی۔ ۱۲ے

علامہ جصاص رازی اس سورت کی آیت ولا انتم عابدون ما اعبد کے ذیل میں لکھتے ہیں:

فانها قد دلت على ان الكفر كله ملة واحدة، لا ن من لم يسلم منهم مع اختلاف مذا هبهم مرادون بالاية. ثم جعل دينهم دينا واحدا و دين الاسلام دينا واحدا فدل على ان الكفر مع اختلاف مذاهبه ملة واحدة۔ ۱۳

''یہ آیت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ کفر کے حاملین ایک ملت ہیں۔ مختلف مذاہب کے لوگ جو اسلام نہیں لائے تھے، یہاں وہ سب مراد ہیں۔ ان کے دین کو ایک دین کہا گیا ہے اور اسلام کو الگ دین قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفر کے ماننے والے الگ الگ مذاہب کے باوجود ایک ملت ہیں''۔ یہود اور نصاریٰ بھی کہا کرتے تھے کہ چاہے یہودیت قبول کرلو چاہے نصرانیت اختیار کرلو، ہدایت مل جائے گی۔ اس کا رد کیا گیا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وقالوا كونوا هودا او نصارى تهتدوا بل ملة ابراهيم حنيفا و ما كان من المشركين۔ (البقرة: ۱۳۵)

''یہ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ تم کہو بلکہ صحیح راہ پر ملت ابراہیمی والے ہیں اور ابراہیم خالص اللہ کے پرستار تھے اور مشرک نہ تھے''۔

وحدۃ الوجود اور علو پر مبنی صوفیہ کے نظریات

تصوف کے حاملین میں جب غلط افکار نے جڑ پکڑی تو اس کی بنا پر وحدت ادیان کے فتنے نے پھر جان پکڑی اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا گیا کہ تمام مذاہب اور عبادت کے تمام طریقوں سے اللہ کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر نے نیکلسن کے حوالے سے لکھا ہے:

''عیسائیت، جدید افلاطونی افکار، بدھ ازم سمیت کئی افکار

اور فلسفے ہیں جن کا اسلامی تصوف پر گہرا اثر ہے۔ جس زمانے میں تصوف نے پروان حاصل کیا، اس زمانے میں ان تمام مذاہب اور فلسفوں کا غلغلہ تھا، لہٰذا تصوف پر ان کی گہری چھاپ کا لگنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت سی دلیلیں شاہد ہیں۔ خلاصہ کلام کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تیسری صدی میں تصوف ایک مسلک کے طور پر سامنے آیا جو بہت سے افکار اور خیالات کا نتیجہ تھا۔ اس میں اسلامی عقیدۂ توحید کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کا تصور رہبانیت اور ہندوؤں اور یونانیوں کا فلسفہ بھی شامل تھا''۔ ۱۴؎

علم تصوف میں شامل ہونے والے تین نظریات: وحدۃ الوجود، حلول اور اتحاد، آخر میں وحدت ادیان ہی کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں۔ مثلاً! ابن عربی کے ایک شعر سے اس کی ترجمانی کچھ اس طرح ہوتی ہے:

لقد صار قلبی قابلا کل صورۃ　　وبیت لأوثان و کعبة طائفٍ

اذین بدین الحبانی توجهت　　فمرعی لغزلان ودیر لرهبان

وألواح توراۃ و مصحف قرآن　　رکائبه فالحب دینی و ایمانی ۱۵

میرا دل ہر صورت قبول کر لیتا ہے، ہرن کی چراگاہ ہو یا کسی راہب کی کٹیا، بت کدہ ہو یا طائف کا کعبہ، تورات کی تختیاں ہوں یا مصحف قرآن، میں دین محبت کا ماننے والا ہوں اس کے سوار جہاں چلے جائیں محبت ہی میرا دین وایمان ہے۔

اسی طرح ایک اور اسی عقیدہ کے حامل صوفی شاعر کے خیالات شعر کے قالب میں کچھ اس طرح ڈھلتے ہیں:

مسلم أنا ولکنی نصرانی و برهمی و زرداشتی

توکلت علیك ایها الحق الأعلی

مسجد او کنیسة او بیت أصنام

لیس لی سوی معبد واحد

ووجهك الکریم فیه غایة نعمنی ۱۶

میں مسلمان ہوں، لیکن نصرانی، برہمن، زردشت بھی ہوں ہوں، یا حق تعالیٰ تجھ پر میں اعتماد رکھتا ہوں، میرے لیے ایک ہی عبادت گاہ ہے: مسجد ہو یا کنیسہ یا بت کدہ۔ تیرا معزز چہرہ میری لذتوں کی انتہا ہے۔ نہ وہ مجھ سے الگ رہ سکے نہ وہ مجھ سے الگ ہو سکے۔

بکر بن عبداللہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''نظریہ وحدت ادیان کو کچھ ایسے داعی ومبلغ میسر آئے جو وحدۃ الوجود، اتحاد اور حلول کا عقیدہ رکھتے تھے۔ یہ ملحد صوفیہ کا گروہ تھا، جس کا تعلق مصر، شام، فارس اور عجم کے علاقوں سے تھا۔ غالی قسم کے روافض، ان کے وارث بنے، انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہود ونصاری بننا بھی جائز ہے بلکہ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو یہودی و عیسائی ہونے کو مسلمان بننے پر فوقیت دیتے تھے''۔ ۱۷؎

ان نظریات کے عروج کے وقت شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے دلائل سے ان کا مقابلہ کیا اور اپنی کئی کتب میں ان کا زبردست رد کیا۔ ۱۸؎

بھگتی تحریک جب مسلمان تاجر ہندوستان میں آئے اور انھوں نے اخلاق ومساوات کا بہترین نمونہ پیش کیا تو ہندوؤں کے ذات پات، چھوت چھات پر قائم معاشرہ کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ اس وقت ہندو مفکرین اور مذہبی مصلحین نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے اسلام کی روح کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اور مسلمانوں کی تہذیبی وتمدنی انفرادیت کو ختم کرنے کے لیے ایک نیا فرقہ تشکیل دیا جو بھگتی تحریک کہلاتا ہے۔ یہ تحریک ہندو اور مسلمانوں کے مذہب کے اتحاد کی ایک مقبول عام کوشش کے طور پر مشہور ہے۔ اس کا سب سے مشہور داعی 'کبیر' ہے، جو ہندو اور مسلم عقائد کی وحدت کا ایک بڑا علم بردار تھا۔ اس نے دونوں مذاہب کے مشترک عناصر اور باہمی مشابہتوں کا انتخاب کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے فلسفیانہ تصورات وشعائر مذہب کے مابین بہت سی مماثلتیں نکال کر ایک درمیانی راہ کی تعلیم دی۔ وہ کہتا ہے:

''ہندو مندر میں جاتے ہیں اور مسلمان مسجد میں، لیکن کبیر اس جگہ جاتا ہے جہاں ہندو اور مسلم دونوں جاتے ہیں، دونوں ادیان دو شاخیں ہیں وران کے بیچ سے ایک شاخ پھوٹتی ہے جو دونوں سے آگے نکل گئی ہے۔۔۔ اگر تم کہو کہ میں ہندو ہوں تو یہ صحیح نہیں اور اگر کہو کہ میں مسلمان ہوں تو یہ بھی صحیح نہیں۔ میں عناصر خمسہ کا وہ مرکب جسم ہوں جہاں وہ غیبی کارفرما ہے۔ بالیقین مکہ معظّمہ کاشی ہو گیا ہے اور رام رحیم ہو گیا ہے۔ ۱۹؎

کبیر چوں کہ ہندو مسلم کو یکتا خطاب کرتا ہے، اس لیے خدا کے لیے رام، ہری گوبند، برہما، سمرتھا، سائیں، اللہ، رحمان، رحیم تمام الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس کا مشہور قول ہے کہ: اہل شعور کا مذہب ایک ہی ہے، خواہ وہ پنڈت ہوں یا شیوخ۔ ۲۰؎

ڈاکٹر تارا چند کا کبیر کے افکار پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

''کبیر نے اسلام اور ہندومت کے امتزاج کی اولین

کوشش کی۔ جنوبی ہند کے ہندو گروؤں نے مسلم عناصر کو جذب کر لیا تھا، لیکن کبیر وہ پہلا شخص ہے جس نے ایکم کزی مذہب، ایک بیچ کی راہ کا بے باکانہ آگے آ کر اعلان کیا۔ کبیر کے بے شمار ہندو مسلم ماننے والے تھے، لیکن کبیر کے پیروان مذہب کی تعداد اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا کہ کبیر کا وہ اثر جو پنجاب، گجرات اور بنگال تک پھیل گیا اور دور مغلیہ میں بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک 'عاقل بادشاہ' نے اس کے مذہب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ اس کو سرکاری مذہب بنا لیا جائے۔ ۲۱۔

اکبر کا دین الٰہی

وہ 'عاقل' بادشاہ، جس کی طرف ڈاکٹر تاراچند نے اشارہ کیا تھا کہ اس نے کبیر کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس کے مذہب کو سرکاری طور پر رائج کرنے کی کوشش کی وہ کوئی اور نہیں، مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر ہے۔ اس کے دور میں اسلام اور ملت اسلامیہ کی انفرادیت مٹا کر مذاہب کی مشترک اور مخلوط بنیادوں پر وطنی قومیت اور متحدہ کلچر کو فروغ دیا گیا اور وحدتِ ادیان کے نعرے سے متاثر اکبر نے اتحادِ مذاہب کی نمایاں مثال پیش کی۔

عزیز احمد اس کی فکر کے متعلق لکھتے ہیں:

''۱۵۷۹ء اور ۱۹۸۲ء کے درمیان اکبر اپنے روحانی تجربات کے نہایت نازک دور سے گزرا۔ ۱۵۸۱ء میں اس نے اپنے دین الٰہی کا اعلان کیا، جس میں عقل کو مذہب کے سمجھنے کے لیے بنیاد قرار دینے پر زور دیا گیا۔ ۲۲۔

دین الٰہی کے بنیادی نکات درج ذیل تھے:

۔دس صفات کی تلقین: وسیع القلبی، برے افعال پر صبر اور نرمی کے ساتھ غصہ کو دفع کرنا، زہد و اجتناب، شدید مادی مشاغل سے علیحدگی، تقوی، دین داری، ہوش مندی، شرافت، مہر و محبت، خدا سے لگاؤ، اور خدا طلبی کی آرزو میں روح کی صفائی۔

۔سورج، نور اور نار کے ساتھ غیر معمولی شغف۔ (آفتاب پرستی یعنی پارسی مذہب کی شمولیت)

۔گوشت خوری سے حتی الوسع اجتناب۔

۔ہندو تہوار دیوالی کے موقع پر گائے کی پرستش۔

۔گنگا جل کو متبرک قرار دینا۔

۔ہندو عورتوں سے شادی اور صلح کل کے نام پر بت پرستوں کو اہل کتاب قرار دینا۔ ۲۳۔

بہائیت یا بابائیت

وحدت ادیان کا پرچار کرنے والے گروہوں اور تحریکوں میں سے بابیت اور بہائیت بھی ہیں جنھوں نے شریعتِ اسلامیہ کو منسوخ قرار دیا اور ایک نئی شریعت بنا کر پیش کی گئی۔

اس تحریک کا بانی تو علی محمد باب تھا، جس نے ابتدا میں 'باب' (امام مہدی اور لوگوں کے درمیان واسطہ) ہونے کا دعویٰ کیا۔ آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا۔ اس نے ایک نیا 'قرآن' بھی لکھا اور اسلامی شریعت کی منسوخی کا اعلان کیا۔ اس کے بعد اس کا سب سے خاص مرید مرزا حسین علی المعروف بہاؤ اللہ نے نبوت کا اعلان کیا۔ اس طرح بابائیت، بہائیت میں تبدیل ہوگئی۔

بہاؤ اللہ نے جو نیا دین پیش کیا اس کی مندرجہ ذیل پانچ تعلیمات سب سے اہم ہیں: (۱) وحدت ادیان (۲) وحدتِ اوطان (۳) وحدتِ لسان (۴) امن عالم بذریعہ ترکِ جہاد (۵) مساواتِ مرد و زن ۲۴۔

اس کی پہلی تعلیم وحدت ادیان سے متعلق ہے، جس میں اس کا یہی عقیدہ ہے کہ باقی رہنے والے چیز اتحاد و اتفاق ہے۔ اس کا بیٹا عبدالبہا جو کہ اسی عقیدہ کا حامل ہے، لکھتا ہے:

A fundamental teaching of Baha'u'llah is the oneness of the world of humanity. Addressing mankind. He says: "Yes are all leaves of one tree and the fruits of one branch." By this it is meant that the world of humanity is like a tree, the nations or peoples are the different limbs or branches of that tree and the individual human creatures are as the fruits and blossoms thereof. His Holiness Baha'u'llah has announced that the foundation of all the religions of God is one; that oneness is truth and truth is oneness which does not admit of plurality". ۲۵۔

یعنی بہائی عقائد کے مطابق اس دنیا میں انسانیت بھی ایک ہے تمام ادیان مذاہب اور افکار کی بنیاد اور جڑ ایک ہے جو وحدت ادیان پر قائم ہے۔

فری میسن تحریک

فری میسنری یہودیوں کی سب سے بڑی اور خفیہ عالمی تنظیم ہے، اس کے ارکان کا تعلق مختلف مذاہب اور اقوام سے ہوتا ہے، جن کو فری میسن کہا جاتا ہے۔ ۲۶۔ یہ تنظیم اپنے اثرات اور اسرار کے باعث بہت سے افراد

کے لیے ایک معمہ کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کا ایک مقصد تمام ادیان کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک انسانی اخلاقیات کا منشور پیش کرنا ہے، جس کے لیے وقتاً فوقتاً کی جانے والی کوششیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ بکر بن عبداللہ لکھتے ہیں:

''ایک عرصہ تک لوگوں کے دلوں میں یہ تباہ کن سازش پوشیدہ رہی، جو اسلام کا برائے نام دعوی کرتے اور دلوں میں کفر والحاد چھپاتے رہے۔ بالآخر اسے ماسونیت (فری میسن) نے اختیار کر لیا۔ یہ یہودی تنظیم ہے، جس کا مقصد الحاد اور اباحیت کی تشہیر تھا۔ اس نے تینوں مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) کی وحدت کی دعوت دی اور اللہ پر ایمان کے معاملے میں مذہبی تعصب ترک کرنے کا نعرہ دیا۔ اس کی نظر میں سب مؤمن ہیں۔ ۲۷۔

اس تنظیم کا ہدف یہ ہے کہ تمام مذاہب کو ختم کر کے یا ان کا چربہ بنا کر ایک 'مذہب انسانیت' تشکیل دیا جائے۔ جواد رفعت اتلخان نے لکھا ہے:

''عالمی ماسونیت کا رس اس دعوت کو عام کرنے میں زبردست کردار رہا کہ تمام ادیان کو ختم کر کے ایک دین کو باقی رکھا جائے، جس کا انھوں نے 'بین الاقوامی انسانی وحدت' نام دیا''۔ ۲۸۔

نظریہ وحدت ادیان کے حاملین کی سرگرمیاں

۔ پوپ نے اپنے آپ کو پوری دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ وہ تمام ادیان کا روحانی و مذہبی قائد ہے، عالم اسلام اور عام انسانیت کا رہنما ہے اور بین الاقوامی پیغام کا حامل ہے۔

۔ پوپ نے ۲۷ / اکتوبر ۱۹۸۶ء کے دن کو تمام ادیان کی عید کا دن اور یہ عام بھائی چارے کا دن قرار دیا۔ پھر ایک ترانہ تیار کیا گیا، جسے تمام لوگ پڑھنے لگے۔

۔ اس نظریہ کو پھیلانے کے لیے تمام عالم اسلام میں اجتماعات، اجلاس، مکالمے، مذاکرے کیے گئے اور جماعتیں تشکیل دی گئیں جو ایک دین کی دعوت دیں اور اس کے لیے محافل ومجالس کا انعقاد کریں۔

۔ ۱۵۔ ۱۶ فروری ۱۹۸۷ء کو ایک اجلاس میں اس تنظیم کا نام 'المؤتمر الابراہیمی' متعارف کرایا گیا۔ یہ اجلاس قرطبہ میں ہوا۔ اس میں شرکت کرنے والوں میں یہودی، قادیانی، اسماعیلی، باطنی فرقے اور مسلمان بھی شامل تھے۔ اس اجلاس میں مؤتمر الحوار الدولی للوحدۃ الابراہیمیۃ کے نام

سے مذاکرے اور مکالمے ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک اور ادارہ بنایا گیا، جس کا نام 'معہد قرطبہ لوحدۃ الادیان فی اوربا' رکھا گیا۔

۔ مارچ ۱۹۸۷ء کو ایک جماعت بنائی گئی، جس کا نام 'المومنون المتحدون' رکھا گیا۔

۔ ایک اور جماعت بنائی گئی جس کا نام 'نادی الشباب المتدین' تجویز کیا گیا۔

۔ اسی طرح ایک اور جماعت بنائی گئی، جس کا نام 'الناس متحدون' رکھا گیا۔

۔ ایسی تنظیمیں اور جمعتیں بنائی گئیں جن کا ہدف یہ تھا کہ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان جو امتیازی اوصاف ہیں، انہیں ختم کر دیا جائے۔ اس کے لیے ایک نام 'موحدۃ الادیان' روشناس کرایا گیا۔ ۲۹۔

وحدت ادیان کے محرکات ونتائج

اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھنی مشکل نہیں کہ دشمنان اسلام مختلف ہتھکنڈوں سے ہمیشہ اسلام کی بیخ کنی میں مصروف عمل رہتے ہیں چاہے وہ ظلم کی راہ سے ہو یا خوش نما وعدوں کے ذریعے، یہ لوگ اپنی ناپاک سازشوں کو کامیاب کرنے میں لگے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طریقے سے مسلمانوں کو کمزور کر دیں اور انہیں مرتد و کافر بنا دیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَدُّواْ لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُواْ فَتَكُونُونَ سَوَاء

(النساء: ۸۹)

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرنے لگو جیسے وہ خود کافر ہیں۔ تاکہ تم اور وہ یکساں ہو جاؤ۔

اسی بنا پر یہ لوگ کبھی دشمنی اور کبھی دوستی کے لبادے میں مختلف طریقوں سے مدد لیتے ہیں اور وحدت ادیان کے نظریے کی پشت پر یہی فکر کارفرما ہے۔

فلسفۂ وحدت ادیان کے پیچھے ایک اور محرک یہ خیال ہے کہ انسان اگر 'نیک نیتی' کے ساتھ زندگی گزارنے کا راستہ تلاش کرے تو وہ جس نتیجے پر بھی پہنچ جائے وہ درست ہے۔ اس خیال کے حاملین کو اضافیت کے قائلین (Relativists) کہا جا سکتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک 'مطلق حق' کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے، بلکہ حق یا سچائی کے مختلف روپ یا درجات ہیں۔ آدمی جس درجے تک بھی پہنچ جائے وہ اس کے لیے کافی ہے۔ ۳۰؎

فلسفۂ وحدت ادیان کے آغاز اور اس کی تعلیم کے فروغ کے پیچھے ایک محرک اسلام کی حقانیت کے خلاف ردِ عمل بھی ہے، خصوصاً ہند میں وحدت ادیان کی فکر کے فروغ کی بنیادی وجہ خود حفاظتی اور ہندو روحانیت کے قیام و دوام کی خواہش ہے۔ ۳۱؎

نظریہ وحدت ادیان کو قبول کرنے اور اس کی تائید کرنے سے جو نتائج لازم آتے ہیں انھیں ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ عقیدۂ ولاء و براء کی نفی

اس کا اولین نتیجہ یہ لازم آتا ہے کہ شریعت اسلامی کے حکم الموالاۃ فی اللہ والمعاداۃ فی اللہ سے روگردانی ہوتی ہے۔ شیخ مقصود الحسن فیضی لکھتے ہیں:

''وحدت ادیان کا نظریہ عقیدۂ موالات و معادات کے یکسر منافی ہے۔ حالاں کہ لا الہ الا اللہ کے شرائط ولوازم میں سے عقیدۂ موالات و معادات بھی ہے۔ وحدت ادیان کا نظریہ قبول کر لینے کا صاف مفہوم یہ ہے کہ ہماری موالات اللہ و رسول اور اہل ایمان کے ساتھ ساتھ کفار و مشرکین اور منافقین سے بھی ہے ۳۲؎

۲۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی نفی

اسلام کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہوئے اور باقی ادیان کو منسوخ سمجھتے ہوئے مسلمانوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو حکم دیا گیا ہے ظاہر ہے وحدت ادیان کو مان لینے کی قبولیت سے اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، وحدت ادیان کی فکر کو تسلیم کر لینے سے خود بہ خود ہی تمام مذاہب و ادیان کی حقانیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ روح جہاد کا خاتمہ

وحدت ادیان کا نظریہ قبول کر لینے کا ایک برا اثر یہ بھی لازمی ہے کہ اسلام میں جہاد نام کی کوئی چیز باقی نہ رہے، کیوں کہ جہاد کی اصل فرضیت اعلاءِ کلمۃ للہ کے لیے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مبارک دین کی تبلیغ میں اگر کوئی جماعت اور قوم رکاوٹ بنے تو اس کے خلاف جہاد فرض ہے۔ اب جب سارے مذہب ایک دوسرے کی حقانیت کو قبول کر لیں تو کسی کو اسلام کی طرف دعوت دینے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔ چنانچہ جہاد کی ضرورت پیش ہی نہیں آئے گی۔ حامد کمال الدین اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''جہاد، ادیان کا فرق نمایاں کرنے سے جنم لیتا ہے، بلکہ دعوت بھی ادیان کا فرق نمایاں کرنے سے ہی جنم لیتی ہے۔ البتہ ادیان کے مابین وحدت یا اشتراک کی تلاش جہاد ہی نہیں دعوت کا بھی قتل ہے۔ ۳۳؎

۴۔ علاقوں سے دست برداری کا اعلان

جب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عقیدے اور جہاد جیسے فریضے سے ہی رجوع کر لیا جائے تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ایسے علاقے اور خطے جہاں غیر مسلم، مسلمانوں پر قابض ہیں، ان سے دست برداری کا اعلان کر دیا جائے۔

مقصود الحسن فیضی کے لکھتے ہیں:

''اس نظریہ کو قبول کرنے کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان خصوصا عرب یا وہ مسلمان جو کسی بھی جگہ غیر مسلموں سے نبرد آزما ہیں اور ظالموں نے ان کی زمین، جائیداد ہڑپ کر رکھی ہے، اب اپنا تنازعہ ختم کر دیں، فلسطین پر ظالم یہودیوں کا قبضہ تسلیم کر لیں، فلسطین اور بیت المقدس کا مطالبہ ترک کر دیں، ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں اپنا تشخص چھوڑ کر ہندوستانی تہذیب میں ضم ہو جائیں''۔ ۳۴؎

نظریۂ وحدت ادیان۔ اسلامی شریعت کی روشنی میں

شریعت اسلامیہ نظریۂ وحدت ادیان کو کلیۃً رد کرتی ہے۔ مختلف علماء کرام نے صراحت سے اس کو رد کیا ہے۔ شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید کہتے ہیں:

''یہ ایک باطل نظریہ ہے جو اسلام کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ حق اور باطل یعنی اسلام اور دیگر مذاہب کو جمع کر دیتا ہے۔ در حقیقت یہ اسلام کی نظریاتی بنیادوں پر ایک شدید حملہ ہے۔ ۳۵؎

مزید لکھتے ہیں:

''معبود واحد ہے، گرچہ اس تک پہنچنے والے راستے مختلف ہیں، یہ ہمیشہ سے وحدت ادیان کے داعیوں کا نعرہ

رہا ہے۔ یہ عین کفر اور گم راہی ہے، دین اسلام تو تمام ادیان کو منسوخ کرنے والا ہے"۔ ۳۶

سعودی عرب کے مستقل فتویٰ کمیٹی (الجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ) نے ایک موقع پر 'وحدتِ ادیان' کے بارے میں یہ رائے دی تھی:

"وحدت ادیان کی طرف اگر کوئی مسلمان دعوت دے تو یہ صریح ارتداد ہے۔ اس لیے کہ یہ بنیادی عقیدہ سے متصادم ہے۔ اس سے کفر پر راغب ہونا لازم آتا ہے اور قرآن کی صداقت پامال ہوتی ہے۔ اسلام نے گزشتہ تمام ادیان و مذاہب کو منسوخ کیا ہے۔ وحدت ادیان سے اس کا انکار لازم آتا ہے۔ اس بنا پر یہ نظریہ نظریہ قابل رد ہے اور قطعی طور پر حرام ہے۔ قرآن و حدیث اور اجماع، سب سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ ۳۷

اس سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مسلمان کسی بھی دوسرے ایسے مذہب سے اتحاد نہیں کر سکتے، جس سے ان کے بنیادی عقائد پر زد پڑتی ہو اور جس سے اسلام میں کسی اور دین کی آمیزش کا شائبہ ہو۔

دیگر مذاہب اور اسلام کے درمیان ہم آہنگی کی حقیقت سب سے پہلے تو اس حقیقت کا تعین کرنا ضروری ہے کہ اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں جو انسان کی صرف نجی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو اور جس کا کل سرمایہ کچھ عبادات، اذکار اور رسوم ہوں، بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو اللہ اور اس کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر اور صورت گری کرتا ہے۔ اور زندگی کے ہر پہلو کو ہدایت الٰہی کے نور سے منور کرتا ہے۔ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشرتی ہو یا تمدنی، مادی ہو یا روحانی، معاشی ہو، سیاسی، ملکی ہو بین الاقوامی۔ اسلام کی اصل دعوت یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اسی کا قانون جاری وساری ہو زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی تعلیمات ہی نافذ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

(المائدۃ: ۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

مولانا مودودی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"دین کو مکمل کر دینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظام فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظام تہذیب و تمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو

اور ہدایت و رہ نمائی حاصل کرنے کے لیے اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے"۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ومن يبتغ غير لا سلام ديناً فلن يقبل منه

(آل عمران: ۱۹)

"اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیے، اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

دین واحد۔ اسلام

یہاں پر یہ بات سمجھنا بھی بہت ضروری ہے کہ دراصل اللہ کے نزدیک قابل اتباع دین ایک ہے اور وہ اسلام ہے، جس کی دعوت تمام انبیاء نے دی اور اسی سلسلے کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہیں۔

مسلمانوں کی کثیر تعداد یہی سمجھتی ہے کہ اسلام کی ابتدا شریعت محمدیہ سے ہی ہوئی۔ اگر چہ یہ معنی ایک خاص جہت سے بالکل درست ہیں، لیکن 'اسلام' کو اس معنی میں محصور کر لینے سے ذہن دین اسلام کے اطلاقی مفہوم سے قاصر رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ دین ایک ہی ہے جو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا۔ چنانچہ اسلام کے اس اصلیمفہوم کو سمجھ کر ہم وحدت ادیان کے قائل لوگوں کی بات کو رد کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس سے وحدت ادیان کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ دین تو بس ایک ہی ہے، چنانچہ جب دوسرا دین کوئی ہے ہی نہیں سوائے اسلام

کے، تو ادیان کی وحدت کا امکان ہی ختم ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللّٰهِ الإِسْلاَمُ (آل عمران: ۱۹)

بے شک دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

علامہ سیوطی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اسلام اللہ کا وہ دین ہے، جسے اس نے مشروع کیا ہے اور اس کے ساتھ اپنے انبیاء کو مبعوث کیا ہے اور اس کے برگزیدہ بندوں نے اس کی توضیح وتشریح کی ہے۔ اللہ اس کے علاوہ کسی دین کو قبول نہیں کرے گا اور صرف اسے کے مطابق عمل کرنے پر بدلہ دیا جائے گا۔

وہ امام ضحاک کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ ان سے پوچھا گیا کہ ان الدین عند اللہ الاسلام سے کیا مراد ہے؟ اس کا انھوں نے جواب دیا ''اللہ نے کسی رسول کو اسلام کے علاوہ کوئی دین دے کر نہیں بھیجا ہے''۔ ۳۹

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انبیاء ورسل اسلام ہی کی دعوت لے کر آئے تھے اور جن لوگوں نے اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کیا وہ مسلم نہیں اور اسلام کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَالُواْ كُونُواْ هُوداً أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُواْ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (البقرۃ: ۱۳۵)

یہودی کہتے ہیں کہ یہودی ہوجاؤ اور عیسائی کہتے ہیں عیسائی ہوجاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ ان سے کہو کہ نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ اختیار کرلو اور ابراہیم علیہ السلام مشرکوں میں سے نہ تھا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''اس جواب کی لطافت سمجھنے کے لیے دو باتیں نگاہ میں رکھیے: ایک یہ کہ یہودیت وعیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ یہودیت اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم وقواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور عیسائیت جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسر ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے تو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء اور نیک لوگ جو ان مذہبوں کی پیدائش سے ہزاروں سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ یہودیت اور عیسائیت نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا معیار ان مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے، جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں، بلکہ دراصل اس کا مدار اس عالم گیر صراط مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے، جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔ ۴۰۔

اور عالمگیر ہدایت محض دین اسلام ہے اور کوئی نہیں۔

دیگر مذاہب کے ساتھ اسلام کا تعلق

اسلام نے دیگر مذاہب کے بارے میں یہ ہدایت دی ہیں، جن کی پابندی کی جانی چاہیے:

احترام مذہب

اسلام کے برحق اور واحد قابل اتباع دین ہونے کے باوجود مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ دیگر مذاہب کے ساتھ احترام کا معاملہ روا رکھیں اور ان کے وہ عقائد جو مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہیں ان کو محض بحث ومباحثہ کی غرض سے برا بھلا نہ کہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلاَ تَسُبُّواْ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّهِ فَيَسُبُّواْ اللّهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ (الانعام: ۱۰۸)

اے ایمان والو! یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں ان کو گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

مکالمہ بین المذاہب

چوں کہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے مطلع کیا گیا ہے کہ اسلام ہی دین برحق ہے، اس لیے ان پر یہ لازم قرار دیا گیا کہ دیگر مذاہب کے ماننے

والوں اسلام کی دعوت دیں۔ چوں کہ وہ آخری امت ہیں۔ اس لیے تمام انسانوں تک پیغام الٰہی پہنچانا ان کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت دینے والوں کے لیے مکالمے کے اسالیب کی نشان دہی کر دی ہے۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ادْعُ إِلِى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيْلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (النحل: ۱۲۵)

دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور مباحثہ کرو لوگوں سے ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو۔

اس آیت میں دعوت وتبلیغ کے تین بنیادی اصول بیان ہوئے ہیں: حکمت، موعظۃ حسنۃ اور مجادلہ احسن۔ یہ تین چیزیں مخاطبین کی تین اقسام کی بنا پر ہیں:

دعوت بالحکمۃ: اہل علم وفہم کے لیے

دعوت بالموعظۃ: عوام کے لیے

مجادلۂ احسن: ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں میں شکوک وشبہات ہوں جو حقائق اور ہٹ دھرمی کی بنا پر بات سے منکر ہوں۔[۴۱]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُون (آل عمران: ۶۴)

کہو اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو، ہم تو مسلم ہیں۔

بدی کا جواب نیکی سے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (حم سجدہ: ۳۴)

اور اے نبی! نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔

اس آیت کے ذریعے مسلمانوں کو ایک اہم تعلیم یہ دی گئی ہے کہ وہ دیگر مذاہب والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور اگر وہ ان کے ساتھ برائی سے پیش آئیں تو ان کا جواب اچھائی سے دیں۔

ان تعلیمات کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات بین ہو کر واضح آجاتی ہے کہ مکالمہ بین المذاہب سے مراد مذاہب کی تعلیمات کا ملغوبہ تیار کر کے اتحاد قائم کرنا مراد نہیں لیا جا سکتا، بلکہ اس سے صرف یہ مراد ہو سکتا ہے کہ مذاہب کے پیروکار مشترکہ مقاصد کے حصول کی خاطر باہم تعاون ورواداری کا مظاہرہ کریں، لیکن اگر اس رواداری کا مطلب مذاہب کی تعلیمات کا اتحاد کر کے کوئی نیا عالمی مذہب (Global Religion) بنانا مطلب ہے تو ایسا کرنا ہرگز روا نہیں۔ کیوں کہ اگر اسلام 'لا اکراہ فی الدین' کے نقطہ نظر کا حامل ہے تو اس کے پاس 'لکم دینکم ولی یدین' کی تعلیم بھی موجود ہے۔ اگر مقصد یہ ہو کہ اپنے مسلک کے خلاف ہم اپنے اوپر دوسروں کے مسلک کا تسلط برداشت کر لیں گے تو یہ رواداری نہیں بلکہ فتنہ رواداری ہے۔[۴۲]

حواشی و مراجع

۱۔ ڈاکٹر احمد بن عبد الرحمن، دعوۃ التقریب بین الادیان، (دار ابن الجوزی، الریاض، ۱۴۲۱ھ) ۱/۳۳۹

۲۔ بسام داؤد عجک، الحوار الاسلامی المسیحی، (دار طیبۃ للطباعۃ والنشر والتوزیع، ۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۸ء) ص: ۴۱۷

Y. Masih, Introduction to Religious Philosophy, P. 359, (Motilal۳۔ Banarsidass Publ., 31 May, 1991).

۴۔ وحید الدین خان، ماہنامہ الرسالہ، مضمون: ''وحدت ادیان کا نظریہ''، اکتوبر ۲۰۱۳ء، (نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نیو دہلی)۔ ص: ۱۰،

۵۔ سلطان احمد اصلاحی، مولانا، وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام، (دار التذکیر، لاہور، ۲۰۰۶ء) ص: ۱۰

۶۔ محمد عبدالرحمن عوض، الاسلام والادیان (ضوابط التقریب بین البشر)، (دارالبشر، القاھرۃ، سن ندارد) ص:۷،

۷۔ ڈاکٹر خالد بن عبدالرحمن الجریسی، فتاوی علماء البلد الحرام، (الجنۃ الدائمۃ البحوث العلماء)، (مؤسسۃ الجریسی للتوزیع والاعلان، الریاض، ۱۴۲۰ھ۔ ۱۹۹۹ء) ص:۱۱۷،

۸۔ دعوۃ التقریب بین الادیان، ۱/ ۳۲۲

۹۔ بکر بن عبداللہ، ابوزید، الابطال لنظریۃ الخلط بین دین الاسلام وغیرہ من الادیان، (دار العاصمۃ للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۴۱۷ھ) ص: ۲۴

۱۰۔ حوالۂ سابق، ص:۱۶

۱۱۔ ص: ۲۴، ص: ۱۲، مقصود الحسن فیضی، وفاداری یا بیزاری، نوراسلام اکیڈمی، لاہور س۔د

۱۲۔ ابن جریر الطبری، جامع البیان عن تاویل آئی القرآن،، (مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۵ھ۔ ۱۹۹۴ء)؛ ص: ۷/ ۵۶۷، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، (دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۹ھ۔ ۱۹۹۸ء)؛ ۸/ ۴۷۹، قرطبی، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القراان، (مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۲۷ھ۔ ۲۰۰۶ء) ۲۲/ ۵۳۳

۱۳۔ جصاص، ابوبکر، احمد بن علی، احکام القرآن، (داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۴۱۲ھ۔ ۱۱۹۴ء) ۵/ ۳۷۶

۱۴۔ احسان الٰہی ظہیر، علامہ، تصوف۔ تاریخ وحقائق، (ادارہ ترجمان السنۃ، لاہور، اگست ۲۰۱۰ء) ص:۱۶۷

۱۵۔ بحوالہ طارق عبدالحلیم، د۔ محمد العبدہ، صوفیت کی ابتداء وارتقاء، ترجمہ: الصوفیۃ نشاتھا وتطورھا، مترجم: مدثر احمد لودھی، (مرکز دارالارقم، ۲۰۰۷ء) ص: ۶۷

۱۶۔ حوالۂ سابق

۱۷۔ الابطال لنظریۃ الخلط بین دین الاسلام وغیرہ من الادیان: ص: ۱۸

۱۸۔ تفصیل سے ان کا رد پڑھنے کے لیے دیکھیں۔ ابن تیمیہ، احمد، الحرانی، مجموعۃ الفتاوی، (دارالوفاء للنشر والتوزیع، ۱۴۲۶ھ ۔ ۲۰۰۵ء) ۵/ ۴۷۔۹۷ کتاب الرد علی المنطقیین، دار ترجمان السنۃ، پاکستان۔ ۱۹۷۶ء

۱۹۔ تاراچند، ڈاکٹر، تمدن ھند پر اسلامی اثرات، مترجم (محمود مسعود احمد) ص: ۲۴۵ (مجلس ترقی ادب، لاہور، دسمبر ۱۹۶۴ء)

۲۰۔ حوالۂ سابق، ص: ۲۵۱، ۲۷۰

۲۱۔ حوالۂ سابق، ص: ۲۷۰

۲۲۔ عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی کلچر، (جمیل جالبی، ڈاکٹر) (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء) ص: ۲۶۰

۲۳۔ تفصیل سے پڑھنے کے لیے دیکھیں: برصغیر میں اسلامی کلچر، ؛ محمد اکرام، ص: ۲۶۰ شیخ، رودکوثر، (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۵ء) ص: ۱۲۳۔ ۱۲۵

۲۴۔ نذیر احمد بھٹی، عبدالرؤف ظفر، بہائیت اور اسکے معتقدات، (قرآنک عریبک فورم، بہاولپور، مارچ ۱۹۹۹ء) ص: ۲۰، ۵۴

Abdul'l-Bah, Baha'i World Faith, P. 246,247 (US Baha'i Publishing ۲۵۔ Trust, 1976)

۲۶۔ تفصیل سے پڑھنے کے لیے دیکھئے:

Mark Stavish, Freemasonry: Rituals, Symbols History of the Secret Society (Llewellyn Publications Woodbury Minnesot, USA, 2007)

۲۷۔ الابطال، ص: ۲۰

۲۸۔ جواد رفعت آتلخان، اسرار الماسونیۃ، ص: ۲۳ (دارالتراث العربی، لیبیۃ، س۔ن)

۲۹۔ محمد الغزالی، قذائف الحق، (دارالقلم، دمشق، ۱۴۱۸ھ۔ ۱۹۹۷ء)؛ الابطال، ص: ۹؛ الاسلام والادیان، ص: ۳۶

۳۰۔ وحدت ادیان کا نظریہ (الرسالہ) ص: ۱۰

۳۱۔ برصغیر میں اسلامی کلچر، ص: ۲۱۴

۳۲۔ وفاداری و بیزاری، ص: ۲۲؛ اسلام میں عقیدہ ولاء و براء کی اہمیت اور حکم کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: القحطانی، محمد بن سعید، الولاء والبراء فی الاسلام، (دارطیبۃ، مکۃ المکرمہ۔ ۱۴۰۱ھ)

۳۳۔ سہ ماہی ایقاظ، مضمون، سعودی عرب۔ تقارب ادیان کی راہ پر، حامد کمال الدین، ص: ۱۶۹ (جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء)

۳۴۔ وفاداری و بیزاری، ص: ۲۵

۳۵۔ المعجم المناھی اللفظیۃ، ص: ۳۷۱

۳۶۔ حوالہ سابق، ص: ۵۲۰

۳۷۔ فتاوی علماء البلد الحرام، ص: ۱۲۱

۳۸۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ستمبر ۲۰۱۱ء) ۱،۳/ ۴۴۴

۳۹۔ سیوطی، جلال الدین، علامہ، الدرر المنثور فی التفسیر الماثور، (مرکز ھجر للبحوث والدراسات، القاھرۃ ل ۱۴۲۴ھ۔ ۲۰۰۳ء) ۳/ ۵۸۸۔

۴۰۔ تفہیم القرآن، ۱/ ۳۵ا

۴۱۔ محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن، (ادارۃ المعارف، کراچی، فروری ۲۰۰۶ء ۵/ ۴۔۶)

۴۲۔ تفصیل کے لیے: اسلامی ریاست از مولانا مودودی، باب اول، بحث: رواداری کا غلط تصور اور اس کا جائزہ: (اسلامک پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۰۸ء) ص: ۶۲۔ ۷۰

فکر

اسلامی نظریہ علم کی بازیافت

انجم اقبال

نظریۂ علم یا علمیات (Epistemology) انسانی علم کے ذرائع اور نوعیت کے مطالعہ کا نام ہے۔ یہ علم کے منبع و مآخذ اس کی ماہیت و فطرت اور طریقِ استدلال سے بحث کرتا ہے۔ ہم کیا جان سکتے ہیں اور کس طرح جان سکتے ہیں، یہ وہ سوال ہیں جو علمیات کے احاطے میں آتے ہیں۔ یہ سوال محض فلسفیانہ نہیں ہیں۔ بلکہ عملی سوالات ہیں جن کے جواب انسانی کارگزاریوں کا رخ متعین کرتے ہیں۔ جو سوسائٹی ہم برپا کرنا چاہتے ہیں وہ ان سوالوں کے صحیح جواب پر توجہ کرے گی۔

بنیادی سوالات:

علمیات (Epistemology) تین سوالات پر توجہ کرتی ہے۔

(۱) اس نفسیاتی کیفیت، رجحان اور طبعی میلان کی کیا خصوصیات ہیں جو انسان کو حصول علم کی جانب متوجہ کرتی ہیں؟

(۲) وہ کیا معیارات ہیں، جن پر کسی خیال یا رائے کے مطابق حقیقت ہونے کو پرکھا جاسکے کہ وہ صحیح اور درست ہے یا نہیں؟

(۳) حصولِ علم کے ذرائع کیا ہیں؟

ان سوالوں کے متعدد جوابات پر یونانی فلسفے میں مفصل بحثیں کی گئی ہیں۔

کسی چیز کو جاننے کے لیے ایک طریقہ مشاہدہ کا ہے مثلاً پیڑ دیکھا تو پہلے سے موجود پہچان سے ذہن نے جان لیا کہ یہ پیڑ ہے گویا حواسِ خمسہ سے چیزوں کی پہچان ہوتی ہے۔ دوسرا طریقہ دلیل لانے کا ہے کہ پختہ ثبوت کی بنیاد پر مان لیں کہ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ سچ ہے۔ عقل عام Sence Common کی بنیاد پر بھی بیانات کو سچ کہا جاتا ہے۔

گویا علم کے ذرائع کون سے ہیں جو سچ تک رسائی میں معاون ہو سکتے ہیں۔ یہ بحث علمیات کی اہم بحث ہے۔

مغرب کا تصور:

مغربی علمیات نے منطق (Logic) اور عقل (Reason) کی بنیاد پر ایک تصور پیش کیا ہے مگر اس میں بہت سے مغالطے موجود ہیں گویا زبان و بیان کی جادوگری ہے۔ Fallacies یعنی مغالطوں کی اقسام جاننا ضروری ہے۔ اس میں ایک غیر تشفی بخش دلیل کا استعمال ہے۔ بعض اہم تعریفیں (Definitions) ہیں جو نامکمل ہیں۔ بسا اوقات محض Logic کو سائنس اور حساب کی حقانیت کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔

اس کے برعکس اسلامی علمیات یعنی نظریۂ علم (Epistemology) اسلامی تصورِ کائنات (World View) سے ماخوذ ہے۔ وہ کسوٹی فراہم کرتا ہے جس پر جانچا جائے گا کہ انسان کے لیے کیا جاننا ممکن ہے اور کیا ناممکن ہے۔ اسی طرح کیا جاننا ضروری ہے۔ کیا جاننا ممکن تو ہے مگر بہتر ہے کہ اس سے گریز کیا جائے۔ اسلامی علمیات لفظ علم کی تشریح کرتی ہے، علم کے مسلمات کو پہچان کراتی ہے، متعدد علوم میں امتیاز قائم کرتی ہے اور علم کے منبع (Source) یا ذرائع علوم کی شناخت کرتی ہے اور ان ذرائع سے حدود مقرر کرتی ہے۔ اسلام میں بنیادی سچائی ایمان ہے۔ ایمان کسی بات کو کسی کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ہے اور دین کی خاص اصطلاح میں خبرِ رسول ﷺ کو محض رسول اللہ ﷺ کے اعتماد پر یقینی طور پر مان لینے کا نام ایمان ہے۔

مغربی نظریہ علم (Epistemology) کی خرابیاں خود مغربی دانش کدے بیان کر رہے ہیں۔ اسلامی تحریروں اور اسلامی دنیا میں اسلامی نظریہ علم کی طرف سے بے توجہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم دنیا میں مغربی نظریہ علم کا غلبہ و تسلط ہو گیا۔ تمام کرۂ ارض پر انسانوں کی ذہنی تربیت مغرب کی طرز پر کرنا باعث فخر قرار پایا۔

تاریخ:

مغربی علمیات کے اسغلبے کی جڑیں تین سو سال پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یورپ نے دنیا بھر کو نو آبادیات کی شکل میں فتح کرنا شروع کیا، سائنس کی معقولیت (Rationality) کا دعویٰ کیا۔ اس کو تمام فطری مظاہر کو سمجھنے کا واحد ذریعہ بتایا۔ یہ جدید سائنس کی علمیات تھی جس کو نئے صنعتی سماج نے اپنایا۔ کاروبارِ حیات کو سمجھنے اور برتنے کے لیے اسے معیار بنا لیا۔ یہ منہج داخلی اور خارجی رجحانات میں فرق پیدا کرتا ہے۔ مشاہدہ کرنے والے اور باہر کی دنیا میں فاصلہ قائم کرنا ہے، جذبات اور حقائق میں تضاد کا قائل ہے جبکہ کائنات میں تضاد کسی ثبوت، مشاہدہ اور دلیل کے بغیر قابل قبول نہیں۔ اس علمیات میں صداقت کو اقدار سے الگ کیا گیا ہے۔ داخلی حقیقت اور خارجی احساس کی تقسیم کی گئی ہے۔ حصول معلومات کا یہ طریقہ ناقص ہے۔ اس لیے کہ حقیقی علم اور دانش اندرونی شعور کے تابع ہوتے ہیں۔ مغربی علمیات میں سچائی کی تلاش کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے کہ سچائی کی فطری کیفیت اور ظاہری شکل دونوں کا مطالعہ کیا جائے۔ تحقیق کو امر واقعہ کے طور پر پرکھنا سائنس کی اہم ترین قدر ہے۔ اس نے انسانیت کو وسائل فراہم کیے ہیں۔

مسلمانوں کا ردِ عمل:

مغربی نظریہ علم کی حاکمیت پر مسلم ردِ عمل سامنے آیا۔ ابتدا میں علم کی قدر و منزلت مسلّم تھی۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ مسلم سائنس داں اور دانشور اگر مغربی علمی بنیادوں پر کام کرتے رہے تو وہ مسلم سوسائٹی میں مغربی قدروں کو رواج دیں گے اور مغربی تہذیب کی لائی ہوئی گھٹن کو بڑھاوا دیتے رہیں گے۔ یہ سائنس اور یہ دانشوری مسلم سماج کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی نہ یہ مسلم دنیا کی سماجی بنیادوں میں جڑ پکڑ سکتی ہے۔

چنانچہ الفاروقی نے بڑے پیمانے پر تمام شعبہ ہائے علوم کو اسلامی طرز پر ترتیب دینے کا طریقہ کار پیش کیا۔ مگر یہ خاکہ اپنی اصل میں مغربی علوم کو محض اسلامی قبا پہنانے کا طریقہ نظر آیا۔

مغربی سماجی سائنس (Social Science) میں مغرب نے کوئی قیمتی دریافت نہیں کی ہے۔ یہ ان کی سائنس اور ٹیکنالوجی ہے جو طاقتور ہے۔ وہ سماجی معاشی اور سیاسی ڈھانچے کی ساخت قائم کرتی ہے جس کی پوری دنیا میں دھوم ہے اور اسی کا بول بالا ہے۔ آج کی سوسائٹی کی شکل آج کی سائنس کی دی ہوئی ہے۔

نتائج:

مغربی علمیات کے کڑوے پھل کم نہیں ہیں۔ علم و آگہی کے فیضان میں اقدار کو سرے سے رد کر دیا گیا ہے۔ استفسار اور کاوش و تحقیق کو صرف مجموعہ معلومات سمجھا گیا جس کا ناجائز استعمال ممکن ہے۔ حقیقت کے جوہر اصلی کو تتر بتر کر کے وسائل کو استفادہ بے جا کے لیے استعمال کرنا جائز سمجھا

گیا۔تمام کرۂ ارض کو کنٹرول میں کرنے اور مکمل تسلط حاصل کرنے کے شوق نے ماحولیات کا ایسا سنگین بحران پیدا کیا ہے کہ زمین پر آدمی مستقبل تباہ کن خطرات میں گھر گیا۔ Biological Reductionism کی انتہائی شکل میں معلومات کے لیے جانداروں کا قتل درست سمجھا گیا۔ سائنس کا جبر وتشدد کوئی اتفاقی چیز نہیں بلکہ یہ اسی غیر معتدل علمیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ نیوٹن، ڈارون، فرائڈ (Sigmund Freud)، اسکنر (B.F.Skinner)، ایڈورڈ ولسن (Edward Wilson) اسی علمیات کے سرخیل ہیں۔ سماجی علم حیات (Social Biology) اور نیوکلیائی ہتھیاروں کے وہ انبار جو تمام کرۂ ارض کو کئی بار مکمل تباہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ سب اسی علمیات کی دین ہیں جس کا بنیادی عنصر اعتدال (Rational) کا دعویٰ کرتا تھا مگر وہ دعویٰ باطل ہے۔

محض مثبت علم اپنے مضر اثر سے خالی نہیں ہوسکتا اس کا لازمی نتیجہ ہے، ایسے اصول اور قانون جنمیں انسانی آفاقی اقدار کی گنجائش نہ ہو۔

فساد:

مغربی دانش کدے معترف ہیں کہ اصل فساد مغربی نظریہ علم کا تھا جس نے ماحولیات کی خطرناک اور ناقابل اصلاح آلودگی کو جنم دیا۔ ایٹمی ہتھیاروں کے انبار ظاہر ہوئے جو کرۂ ارض کو کئی بار تباہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی میں برف کے پگھل جانے سے سمندر کی سطح کے بڑھ جانے کا اندیشہ پیدا ہوا۔ متعدد بڑے بڑے شہروں کے سمندر میں ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔ نئے دور کا انسان اپنی زندگی کو بیماریوں سے بچا کر زیادہ سے زیادہ عمر پانے کا جنون رکھتا ہے۔ اس کے لیے Genetic Engineering کی ایجاد ہوئی۔ اپنے Genes کو درست کر کے ہزاروں سال زندہ رہنے کا خواب دیکھا گیا۔ یہ خاص لوگوں کا سائنسی پروگرام تھا۔ اس کے نتیجے میں بے کاری اور بھوک مری کے خطرات سامنے آئے۔

یہ مان لینا چاہیئے کہ یہ سارے نتائج فکر، خیال اور اس سوچ کی خرابی کے ہیں جو مغربی نظریہ علم کی جان رہا ہے جس نے عالم کی امامت اپنے ذمے لی تھی۔

اس طرح مغرب نے جدیدیت (Modernity) کی موت کا اعلان کر دیا اور ٹیکنالوجی کو یہ ذمہ داری سپرد کی کہ مابعد جدیدیت (Post Modernism) کے دور میں مستقبل کا سفر طے کرائے۔ گلوبلائزیشن کے حوالے سے دولت اور ٹکنالوجی کا تصرف بڑھایا گیا تا کہ ایک ملک یا حکومت سے بڑھ کر تمام انسانوں اور ہر خطۂ زمین پر اثر انداز ہوا جائے، حقیقت (Reality) کے تصور کے Virtualization کو عام کر کے اسے معدوم

کرنے کی کوشش کی گئی۔ سچائی (Truth) کو مابعد جدیدیت نے نظر انداز کیا۔ یعنی Multi-Culturalism سے پیدا شدہ چیلنج اور میڈیا اور ٹیکنالوجی نے مضر اثرات قبول کرنے پر مجبور کیا۔ یہ وہ صورت حال ہے جو خود مغربی استعمار کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی۔

تبدیلیاں:

نئے میڈیا انٹرنیٹ، ویب بوٹ (Web-Bots) وغیرہ ہیں۔ ان میں ہمیشہ آن رہنے والے کپڑوں کی طرح پہن لیے جانے والے کمپیوٹر ہوں گے جو تمام معلومات کو کھلے عام سب کو پہنچا رہے ہوں گے۔ اس سے بڑا چیلنج فطرت پر حملہ آور ہونے والی Genetics ہے، جس میں کلوننگ، جین کے ذریعہ علاج (Genes Therapy) اور Gem Line Engineering کے طریقے ہیں۔ انسان کی فطری موروثی خاندانی ساخت کو انسان نئے جین ترتیب دے کر بدل ڈالے گا۔ موروثی اثرات سے بالکل مختلف اپنی مرضی اور پسند کے بچے پیدا کرنا عام ہو جائے گا۔ کیا اس ٹیکنالوجی کو کوئی روحانی لگام لگانا ممکن ہوگا؟

فطرت سے بغاوت:

حقیقت، سچائی اور فطرت سے بغاوت مغرب کے حق میں بھی اچھی نہیں رہی ہے۔ سفید فام نسلوں کی تیزی سے گھٹتی ہوئی آبادی، بوڑھے لوگوں کی

تعداد میں اضافہ اس کی علامات ہیں۔ تمام ترقی یافتہ دولت مند ملکوں کا مستقبل تاریک ہے۔ کام کرنے والوں اور ریٹائرمنٹ لینے والوں کا تناسب 3 اور 1 کے بجائے 1 اور 5 کا ہوگیا ہے۔ مغرب نے اس کا حل یہ سوچا ہے کہ ٹیکنالوجی کے استعمال سے پیداوار اس طرح بڑھائی جائے کہ انسانی محنت کی ضرورت کم ہوجائے اور باہر سے غیر ملکیوں کو بلا کر کام نہ کرانا پڑے۔ Eugenics کے استعمال سے غیر معینہ مدت تک بغیر تھکے اور بلا سوئے ہوئے دن اور رات کام کرنے والے مشینی انسانوں کی نسل پیدا کرنے کی کوشش جاری ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ گوری نسل میں زیادہ سے زیادہ صحت منداور ہزاروں سال تک زندہ رہنے والے لوگ پیدا کرلیے جائیں ڈارون نے کہا تھا کہ فطری انتخاب سے سماج کے کمزور لوگوں کی نسل میں اضافہ ہوتو باکمال انسانوں کے لیے خسارے کی بات ہوگی۔ جین میں تبدیلی سے یہ خرابی درست کی جاسکتی ہے۔

کسی عقیدہ اور ایمان ویقین کو بغیر خارجی سند کے رد کرنے کا نظریہ معروضیت (Objectivity) کا اصول تھا۔ جس کو خود مغربی مفکرین مثلاً David Hume اور حال ہی میں Kuhn۔T.S نے شدت سے چیلنج کیا ہے۔ مدلل مباحث کے بعد مانا ہے کہ ہماری سمجھ کے لیے دلیل، حجت یا علت کافی نہیں ہے بلکہ علم کو ایک ایسا تصور کہا جائے گا جو قطعی نہیں ہے۔

درجنوں سائنس دانوں اور نوبل انعام یافتہ شخصیتوں کے خیالات نے یہ بات پائے یقین کو پہنچادی ہے کہ مغربی نظریہ علم کے متبادل نظریات علم پر غور کیا جانا ممکن ہے سائنس کی دنیا سے باہر کے دانشوروں نے جن میں Nasr،Roszak اور Lich۔I.L کے نام شامل ہیں، یہ بات سامنے رکھی ہے کہ قابلِ عمل متبادل نظریات علم حقیقتاً موجود ہیں۔

مستقبل:

مغربی تہذیب کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ یہ فاتح تہذیب اپنے مادی فلسفہ حیات میں ہار چکی ہے۔ ہیگل کا فلسفہ تاریخ، ڈارون کا نظریہ ارتقاء، مارکس کی مادی تعبیر تاریخ، سیکولرزم، نیشنلزم، ڈیموکریسی، کمیونزم کے مردہ جسم میں جان ڈالنے کی ناکام کوشش جاری ہے۔ مگر یہ دلیل سے فرار کی راہیں ہیں۔ اخلاقی اور ماحولیاتی فساد کے مجرم سماج کی عدالت میں سزا کے منتظر ہیں۔ اسلام کا علمی نظریہ متبادل راستہ فراہم کرتا ہے۔ مگر ابھی دنیائے حقیقی کی زمام کار طاقتور کے ہاتھ میں ہے وہ اخلاقیات پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔ مغربی رنگ آمیزی ابھی جاری ہے۔ اس لیے کہ مغرب کا دولت مند انسان طاقت اور قوت کے مراکز پر قابض ہے۔ اس کے بالمقابل دنیا میں لاکھوں انسان غذائی قلت کا شکار ہیں اور 6.2 بلین کو بنیادی صحت کی سہولتیں حاصل نہیں اور دنیا کے 200 بڑے مال والے ہر چار سال میں اپنے اثاثے دوگنے کرتے ہیں۔ دنیا کے تین بڑے مالداروں کے اثارے کم ترقی یافتہ ممالک میں بسنے والے 600 ملین لوگوں کی دولت سے زیادہ ہیں۔ یہ اعداد وشمار بتارہے ہیں کہ دولت مند انسانوں نے وہ تمام راستے ہموار کرلیے ہیں جو غریب کو اور غریب تر بناتے ہیں۔ دولت کا بہاؤ تیزی سے چند مالداروں کی طرف ہے۔

زمانہ زندگی کے ہر شعبے میں دولت پر انحصار کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہی گلوبلائزیشن ہے۔ سماجی ڈارونزم کہتا ہے کہ جو Fittest یعنی سب سے زیادہ موزوں ہے وہی جینے کا اور سب پر حکمرانی کا حق رکھتا ہے۔

مغربی نظریہ علم کی حکومت قائم رکھنے میں سائنس اور ٹیکنالوجی بڑے ہتھیار رہیں۔ یہ بات مدنظر رہے اور کبھی فراموش نہ کی جائے کہ یہ مغربی سائنس کا دیا ہوا نظریہ علم Epistemology ہے جس نے جدید دنیا پیدا کی ہے۔

اسلامی تصور:

سائنسی اور سماجی علوم، معاشیات اور سیاسیات، سماجیات اور نفسیات، انسانیات یا بشریات کو اسلامی بنانے سے پہلے سائنس اور ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ نظریہ علم کو اسلامی بنانا ہوگا، اسلامی نظریہ علم سے آراستہ سائنس اور ٹیکنالوجی وہ راستہ ہموار اور فراہم کریں گی جو تمام دوسرے سماجی علوم کو اسلام سے آراستہ کرسکے۔

مغربی علوم کی متعدد شاخیں ہیں مثلاً: نفسیات ہو، سیاسی سائنس، سماجی سائنس اس طرح فطرت کی سائنس ہے جو فزکس، کیمسٹری، بایولوجی پر مشتمل ہیں۔ یہ تمام علوم کوئی آسمان سے اتری ہوئی شے نہیں جو تبدیل نہ کی جاسکیں ان تمام شاخوں کی تقسیم میں مغربی فکر اور مغربی تصورِ حیات اور مادہ پرست اجارہ داروں کے مفادات کی کارفرمائی ہے۔ یہ علوم ایک خاص تاریخی اور معاشرتی پس منظر میں پروان چڑھے ہیں وہ مغربی تصور کائنات کے فروغ میں معاون ہوتے ہیں جو مغربی تصور دنیا میں سچائی کو جانچنے کا پیمانہ ہے۔ یہ مغربی سماج کے مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔ ان علوم کا اسی طرز پر مسلم معاشروں میں پڑھا جانا مسلم تصور کائنات سے متصادم ہے۔ مغربی تصور کائنات کے زیر سایہ زندگی کے مترادف ہے جو کسی بھی مسلم معاشرے کے پنپنے کا راستہ ہموار کر ہی نہیں سکتا۔

مسلم دانشوروں کی گزشتہ نسل یہ کہتی رہی ہے کہ تمام موجودہ علوم سے اسلام کی مطابقت پیدا کی جائے۔ یہ بیل سے آگے گاڑی رکھنے والی بات ہوئی۔ اسلام ہر زمانے کے مستند علم سے ہر دور میں مطابقت رکھتا ہے۔

ضرورت ہے کہ تمام جدید علوم اسلام سے مطابقت پیدا کریں۔ کسوٹی اسلام ہے نہ کہ عصری علوم۔

اسلامی علوم کی تقسیم:

اسلامی تہذیب کے نمونے دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ علم کے نمونے کی اور کردار کے نمونے کی۔ علم کے نظام (Paradigms) میں بنیادی اصول تصورات اور اسلامی قدروں کا احاطہ ہونا چاہیے جو کسی علمی شاخ کو اسلامی بنا سکے۔ کردار سے مراد اخلاقی حصار اور حد بندی ہے جس کے حدود کے اندر رہتے ہوئے کوئی صاحب علم، دانشور، سائنسداں، انجینئر اور ڈاکٹر اپنی علمی کارگزاریاں انجام دے۔ اسلامی نظریہ علم کی بازیافت میں یہ کام اولیں اہمیت کا ہے۔

نظام بنائے جائیں تو متعین کیا جا سکے گا کہ اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے کن علوم پر فوری توجہ ضروری ہے اس طرز پر کہ یہ علوم انسانی فلاح کا باعث ہوں۔

نظاموں (Paradigms) کی تشکیل کے ساتھ خود علوم کے شعبے بھی دو طرح کے ہیں۔ علوم ضروریہ کے شعبے ریاضی، زبان، معاشیات، فزکس، کیمسٹری، انجینئرنگ، طب وغیرہ۔ دوسری قسم ان شعبوں کی ہے جو انسان کی کردار سازی کی خدمت انجام دیں تاکہ انفرادی اور اجتماعی خود احتسابی کے حصار میں رہتے ہوئے زندگی گزارنے کا چلن آ جائے۔ علم کی ان دونوں قسموں کے تمام شعبے اسلامی نظام تصورات کے تحت رہتے ہوئے اس طرح وجود پا جائیں، کہ اسلامی سوسائٹی کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ یہ نظامِ علم و تحقیق اسلامی تصورِ کائنات کی حدود میں رہتے ہوئے امت کے معاشی، مادّی، معاشرتی مسائل حل کرے اور روحانی تزکیہ کا کام کرتا رہے۔

اسلام میں مرد کی نشوونما کو تزکیہ کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ دنیا مغربی طرز پر ترقی کے بھرم کا شکار ہے۔ وہ تمام پیمانے جو اس ترقی کو متعین کرتے ہیں اپنی فکر اور اساس میں مغربی ہیں۔ تزکیہ کے لفظی معنی پاکی، صفائی، نشوونما کے ہیں۔ مغربی طرز پر ترقی Progress اور Development کے مقابلے میں تزکیہ تمام مسلمانوں اور مسلم سوسائٹیوں کو پاکی کے ساتھ نشوونما کا راستہ بتاتا ہے۔

مغربی ترقی دولت مندوں، معاشی اڈے چلانے والوں کی ٹیکنالوجی کی ترقی کے سوا کچھ نہیں۔ پچھلے سو سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس ٹیکنالوجی کا شکنجہ سخت سے سخت ہوتا گیا ہے۔ اس سے نجات محال ہے۔ مسلمان اگر اسی طرز میں اسلامی رنگ آمیزی کے ساتھ ترقی کرنا بھی چاہیں تب بھی دنیا کے ایجنڈے میں فیصلہ کا اختیار نہ پا سکیں گے۔ مغرب کا خیال ہے کہ ہم ترقی یافتہ ہیں اور باقی ترقی پذیر ہیں جو ہمارے ماڈل پر چل کر ترقی کر سکیں۔

لیکن مسلمانوں کے لیے مغربی طرز پر ترقی یافتہ ہونا ایک مردہ تصور ہے۔ مسلمانوں کا صحت مند نشوونما ہر مسلمان اور ہر اسلامی سوسائٹی میں تزکیہ کو نافذ کر کے ہوتا ہے۔ مغربی ''ترقی'' کرنے کی مسلمانوں کو ضرورت نہیں ہے۔

> **مغربی علم کے مقابلے میں اسلامی نظریہ علم تمام علوم کے باہمی مربوط ہونے پر زور دیتا ہے۔ علم کی تمام شاخیں باہم مربوط ہوں اور قرآن کی روح ہر شاخ میں رچی بسی ہو۔ اسلام علم حاصل کرنے کو نہ صرف ضروری قرار دیتا ہے بلکہ اس کو عبادت کا درجہ دیتا ہے بشرطیکہ یہ علم اللہ کو ماننے اور اس کی خوشی حاصل کرنے کے لیے ہو۔**

وسعت:

اسلامی نظریہ علم تجربے اور حقیقت کی دریافت کا راستہ بتاتا ہے۔ ایک سے زیادہ طرز پر فطرت کو سمجھنے، پرکھنے اور برتنے کی گنجائش فراہم کرتا ہے۔

اسلام میں علم کا تصور علم و فن کی تمام قسموں پر محیط ہے۔ اسلام ادراک و آگہی کی ساری سمتیں، فن کی تسلیم کرتا ہے (استعداد اور مہارت سے لے کر عام مشاہدہ کی سبھی قسموں تک) علاوہ ازیں باریک الٰہیاتی مابعد الطبیعاتی اور مافوق الفطرت مسائل تحقیق و گفتگو کو علم کے عنوان میں شامل کرتا ہے۔

علم وحی سے اور عقل (Reason) سے ملتا ہے، مشاہدے اور وجدان سے حاصل ہوتا ہے، روایات تاریخ اور عقائد کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور خالص نظری اور نظریاتی مباحث پر توجہ کی جاتی ہے۔

فطرت کو سمجھنے اور سچائی تک پہنچنے کے سب طریقے اسلام میں برتے جاتے ہیں مگر ان طریقوں کا وحی کے تحت ہونا ضروری ہے۔ یہ اسلامی تہذیب کا سنگ امتیاز ہے۔

مغربی علم کے مقابلے میں اسلامی نظریہ علم تمام علوم کے باہمی مربوط ہونے پر زور دیتا ہے۔ علم کی تمام شاخیں باہم مربوط ہوں اور قرآن کی

روح ہر شاخ میں رچی بسی ہو۔ اسلام علم حاصل کرنے کو نہ صرف ضروری قرار دیتا ہے بلکہ اس کو عبادت کا درجہ دیتا ہے بشرطیکہ یہ علم اللہ کو ماننے اور اس کی خوشی حاصل کرنے کے لیے ہو۔ قرآن کی بتائی ہوئی تمام اقدار کا سیکھنا علم ہے۔ بعض اہم اصطلاحات یہ ہیں: خلافت، عدل، استصلاح۔

علم اور عبادت کو مربوط کرنے سے مراد یہ ہے کہ خدائی فرمان کی خلاف ورزی کرنے والا علم حاصل نہیں کر رہا ہوتا۔ علم اور خلافت کو مربوط کرنا یہ ہے کہ فطرت کے تقدس کا ادراک ہو۔ دنیا میں خدا کا یہ خلیفہ ماحولیات کو پراگندہ کر کے علم حاصل نہیں کرے گا نہ وہ ایسے فن سیکھے گا جو فطرت پر فتح حاصل کرنے کی غرض لیے ہوئے ہوں بلکہ نظام فطرت میں اللہ کی نشانیاں تلاش کرنے کے لیے علم سیکھے گا۔ یہ علم مادّی دنیا کو مسخر کرنے اور روحانی حقیقتوں تک پہنچنے کا عمل ہے۔

ارتباط:

اسی طرح علم و عدل کو مربوط کرنا یہ ہے کہ علم سماجی عدم برابری کو ختم کرے معاشرتی اور معاشی انصاف قائم کرنے کا ذریعہ بنے۔ وہ راستہ ہموار کرے جو مسلم معاشرے کی صحت مند نشو و نما کے لیے درکار ہے۔ ایک شعبہ علم دوسرے شعبہ علم کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں۔ مسلمان فلکیات، زراعت، ریاضی، سائنس، دینیات اور دیگر علوم کو بڑھاتے چلے گئے چونکہ یہ ان کی تہذیبی ضرورت تھی۔ سائنس جب مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی اور جب تک مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی وہ کوئی اور شے تھی۔ اس کا مقصد دولت پیدا کرنا نہیں تھا فلاحِ عام تھا۔

یہی کام آج کرنے کا ہے۔ مغرب کی علمی کاوش انسان کے اللہ کا خلیفہ ہونے کا تصور نہیں رکھتی۔ یہ محض معاشی تصورات پر مبنی ہے۔ نہ عام آدمی کی فلاح اس کا مقصود ہے۔

مسلم علما، دانشور، سائنس داں، انجینئر اور مسلم سوسائٹیوں کے لیے ضروری ہے کہ اس مشکل مگر قابل عمل کام کی باگ ڈور سنبھالیں کہ مغرب میں حاصل کردہ معلومات کو اسلامی اقدار کے امتزاج کے ساتھ سیکھنے سکھانے کا چلن قبولِ عام حاصل کر سکے۔

مسلمانوں کا کام:

عصری علوم کو اسلامی اقدار کے تحت لانے میں جدید علوم سے وابستہ دانشوروں کی توجہ ضروری ہے۔ اس میں مغرب میں بسنے والے سائنس دانوں کا رول اہم ہے۔ انگریزی زبان میں ان عنوانات پر کام جاری ہے۔ روایتی و دینی علوم سے وابستہ علماء کرام کو بھی توجہ کرنی چاہیے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور شریعت کی مروجہ تعلیم کافی نہیں۔ آج مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی

صرف فن نہیں عالمی اجارہ داری کے ہتھیار ہیں۔ ہمیں بھی طاقت کے ہتھیار سے لیس ہونا ہے اور گوشہ نشینی سے فراغت پا کر حالات کے تقاضوں سے آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرنی ہے۔

اسلامی علماء نے بتایا کہ علم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے براہِ راست استفادہ اللہ کے اوامر کو محمد ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر سمجھنا۔ اس غرض کے لیے اللہ کی رضا کی طرف لے جانے والا علم حاصل کرنا اس بات کی تحقیق کرنا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

یہ وہ علم ہے جو اطاعت پر آمادہ کرتا ہے۔ جو علم اللہ کی اطاعت کا جذبہ نہ پیدا کرے وہ علم نہیں۔

ہمیں اپنے علماء کو متوجہ کرنا ہے مغربی علمیات اور نظریہ علم Western Epistemology کی حاکمیت ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی Islamic Epistemology کی حاکمیت قائم کرنے کی خاطر عصری علوم سے واقفیت لازم ہے۔ اللہ کے اوامر کو رسول ﷺ کی بتائی ہوئی تشریح کے مطابق سمجھنا چاہیے۔

مفید علم وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کا جذبہ پیدا کر دے تمام معلومات عصری کو اسلامی تصورِ کائنات کے احاطے میں لانا ایک اہم فریضہ کہا جائے گا۔ اللہ کی اطاعت تقویٰ پیدا کرتی ہے۔ تقویٰ تنہائی میں خدا سے ڈرنے کو کہتے ہیں۔ تقویٰ ایمان سے ہے اور ایمان سچائی کا اقرار ہے۔ علم کا اسلامی پیمانہ وحی و قرآن کی بالادستی قائم کرنا ہے اسے نہ صرف مسلمان جانیں بلکہ تمام دنیا کی علمی تحقیق میں سچائی کے اس پیمانے کا چلن ہو۔

بزم

قرآن کا تصورِ انسان

محمد صادق

تعارف:

عہدِ طفولیت کے بعد جب انسان شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو وہ چند سوالات کے جوابات کا متلاشی ہوتا ہے۔ یہ مخصوص سوالات انسان کی جبلت میں بہت قوی ہوتے ہیں۔ مثلاً: اس کائنات کا رب کون ہے؟ میں کون ہوں؟ موت کے بعد انسان کا انجام کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ۔

یہ چند سوالات تصورِ حیات کے حوالے سے ہر شخص کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ بعض افراد ان سوالات کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ بعض کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ یہاں فریڈ ریش انگلس کے تجزیہ کی نفی ہوجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو اولاً تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی چاہیے اور اس کے بعد ہی وہ فلسفہ وغیرہ کے مسائل پر تدبر کرتا ہے۔ لیکن تجرباتی مشاہدہ ہمیں اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ سوالات انسانی فطرت سے مطابقت رکھتے ہیں اور قدرت کا وسیع و عریض کارخانہ شب و روز اس کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے لہٰذا کسی ساعت بھی اس کا ذہن ان سوالات سے انقطاع نہیں کرتا۔

زندگی کے مادی مسائل کے تیز و تند تھپیڑوں میں یہ سوالات انسان کے تحت الشعور میں جگہ پا لیتے ہیں اور جب کبھی تنہائی کے اوقات اس کو میسر آتے ہیں تو یہ سوالات انسانی وجود کو بے چین کر دیتے ہیں۔ انسانی وجود کے ان اساسی سوالات کی قدر و قیمت اس بات سے متعین ہوجاتی ہے کہ چار ہزار سالہ فلسفہ کی تاریخ نے تصورِ حیات کی ان گتھیوں کو سلجھانے کی کاوش میں اپنا قیمتی وقت صرف کر ڈالا ہے۔

قدیم یونان کے معروف فلسفی ارسطو، تھیلس، افلاطون وغیرہ ہوں یا مشرقی دنیا کے لاؤتسو(Lao Tzu)، کنفوسش، گوتم بدھ وغیرہ ہوں یا پھر دورِ جدید کے مفکر و فلسفی مثلاً مارکس، ہیگل، فرائڈ، ڈارون، لوکی، ہیوم، رسل، ملٹن وغیرہ، سبھوں نے ان سوالات کو اپنی تحقیق و ریسرچ کا موضوع بنایا ہے۔

ان سوالات میں یہاں زیرِ غور انسان کا تصور ہے اور اس کی بابت ان فلسفیوں نے عقل کے گھوڑے دوڑائے ہیں، کائناتِ اصغر یعنی (انسان) کو Define کیا اور اس کی توجیہ پیش کی ہے۔ اس کڑی میں مذہب نے بھی اپنا کلیدی رول نبھایا ہے بلکہ یہ کہا جانا چاہیے کہ مذہب کو ہی یہ اعجاز حاصل ہے کہ انسانی وجود کو تصوراتی بحث سے نکال کر جامع انداز میں Define کیا ہے۔ دینِ فطرت نے انسان کی جامع، ہمہ گیر اور تمام جہتوں کو افادی اور ماہیتی طور پر پیش کیا اور ساتھ ہی کائنات میں اس کے مقام کو متعین کیا ہے۔

فلسفہ و حیاتیات کا تصورِ انسان

☆ فلسفہ کے احاطہ میں جتنے بھی نظریات آتے ہیں اکثر نے انسان کی کسی مخصوص جہت کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ مشرقی مذاہب نے بھی افراط وتفریط میں سے کسی ایک حیثیت کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆ ارسطو انسان کو ایک سماجی جانور قرار دیتا ہے۔ ارسطو کے مطابق انسان ایک حیوانی وجود رکھتا ہے اور ارتقاء کے مراحل سے گزر کر وہ تہذیب وتمدن سے آشنا ہو گیا اور رہن سہن کے کچھ طور طریقے اس کی عقل و دانش میں راسخ ہو گئے اور وہ ان تغیرات کے باعث ادنیٰ مقام سے عظمت کی جانب ترقی کرتا گیا۔

☆ انگریزی کا ایک مشہور فقرہ ہے کہ Man is truth seeking animals۔ اس کی روشنی میں بھی انسان کی تمام جہت محیط نہیں ہو پاتی۔ یقیناً اس فقرے میں انسان کی عظمت کو ایک درجہ اعلیٰ حیثیت ضرورت ملی ہے۔ لیکن اس فقرے میں ایک وضاحت طلب عنصر یہ ہے کہ جب تک ہم Truth کو واضح انداز میں Define نہیں کر لیتے انسان کا منطقی وجود پوری طرح روشنی میں نہ آ سکے گا۔ لیکن یہ فقرہ انسان کی ایک نمایاں Dimension کو بڑی حد تک ادراک میں لاتا ہے۔ یعنی ''علم کی طلب''۔

☆ امام غزالیؒ کا مشہور قول ہے کہ انسانوں کے درمیان جس چیز کی سب سے زیادہ ضروری اور گہری حیثیت ہے وہ علم ہے۔

انسان ہونے کا ایک مطلب لازمی ہے یا کوئی وجود اپنے آپ کو انسان کے طور پر qualify کرنا چاہے تو اسے دو حالتوں میں سے ایک حالت کا حامل ہونا ضروری ہے یعنی وہ یا تو ''معلم'' ہوتا ہے یا متعلم۔

اس گفتگو کے تعین کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم یا مادۂ علم ایک ایسا عنصر ہے جو انسان کو Biological Menifestation سے نکال کر اخلاقی وجود عطا کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے بھی یہ مادۂ علم بہت اہمیت کا حامل ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۳۰-۳۳ میں اس Dimension کو روشنی میں لایا گیا ہے۔

یعنی تخلیقِ آدمؑ کے وقت ربِ کائنات نے ملائکہ کی مجلس میں انسانی وجود کی اہم صفت یعنی ''علم'' کو واضح کیا تھا۔

حیاتیات کے Domain میں ایک اہم نظریہ جو مکمل طور پر انسان کے حیوانی وجود کو تسلیم کرتا ہے وہ ڈارون کا نظریۂ ارتقا ہے۔ نظریۂ ارتقا انسان کی خلقت کو ایک اتفاقی نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کا وجود ارتقا کے مراحل سے گزر کر ہوا ہے۔ یہ نظریۂ حیات انسان کے حیوانی وجود کا اصل ماخذ جرثومہِ حیات کو ٹھہراتا ہے یعنی Anaerobic Bacteria۔

اس نظریے نے انسان کا شجرہ بندر سے تجویز کیا ہے۔ چارلس ڈارون نے اپنی شاہکار کتاب Origin of Species میں اس کی وضاحت کی ہے۔ اس نظریہ کا تصورِ انسان یہ ہے کہ انسان ترقی کرتا ہوا ایک جانور ہے۔

قرآن اس نظریہ کی مکمل تردید کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ)

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا ہے، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا، پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

قرآن انسان کی تخلیق کے دو ادوار بیان کرتا ہے ایک وہ جب انسان زمین کے پیٹ سے پیدا ہوا اور دوسرا وہ جب انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''جو چیز بھی اس نے بنائی، خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتداء گارے سے کی، پھر اس کی نسل کو ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔ پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔''

قرآن کا موقف:

تاریخ کے مطالعے سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کا مقام اور تصور افراط وتفریط میں سے کسی ایک انتہائی مقام پر فائز رہا ہے۔

افراط پر فائز انسانی تصور نے نکیر، سرکشی، مغرور، جبر وقہر کے مجسمے کے طور پر خود نمائی کی ہے۔ تاریخ نے بارہا انا ربکم الاعلیٰ کی صدائیں سنی ہیں۔ فرعون، نمرود، ہٹلر، مسولینی وغیرہ افراطی تصورات کی زندہ مثالیں ہیں۔

جب انسان تفریط میں گم ہو گیا تو خود کو بے بس، کمزور، ناتواں، حقیر سمجھ بیٹھا اور ہر ساعت سوز وگداز، یاس وحرماں جیسی کیفیات میں مبتلا رہنے لگا۔ انسان اس کے تصور تعین کیونکہ تاریخ اور دورِ حاضر میں بھی ملتا ہے یہ واضح ہے۔ کائنات کی تعمیر تخریب کے نقاب میں پوشیدہ ہے۔ تفریط سے مارا انسان کائنات میں اپنے وجود کو حقیر سمجھتا رہا۔ کائنات میں جو تعمیری حسن تھا وہ انسانی

آنکھوں سے اوجھل رہی اور وہ تخریب کی ہولنا کیوں میں سہم گیا۔ یہ سورج، چاند، بڑے بڑے پہاڑ، بجلی کی ہولنا کی، سیلاب اور اپنے وجود کی ناتوانائی، وکمزوری اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کرگئی اور انسان رفتہ رفتہ نیچر پرست بن گیا۔

قرآن ان دونوں انتہائی تصورات کی نفی کر کے انسان کو Redefine کرتا ہے اور اس کی Objective Reality اور Menifestation کو وقار کے ساتھ اعلیٰ ترین مقام پر رکھتا ہے۔ یہ مقام اعتدال وتوازن اور کائنات میں اس کی حیثیت کے تمام جہتوں کو اشرف المخلوقات کے طور پر پیش کرتا ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

''انسان اپنی حقیقت تو دیکھے کہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے جو پشت اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان سے کھینچ کر آتا ہے۔''

سورۃ السجدہ رکوع:۱ میں قرآن فرماتا ہے کہ:

''انسان کی ابتداء مٹی سے کی، پھر مٹی کے نچوڑ سے جو ایک حقیر پانی ہے۔ اس کی نسل چلائی، پھر اس کی بناوٹ درست کی اور اس میں اپنی روح پھونکی۔''

سورۃ یٰسین ۷۷-۷۸ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اس کو ایک قطرۂ آب سے بنایا ہے، اور اب وہ کھلم کھلا حریف بنتا ہے اور ہمارے لیے مثالیں دیتا ہے اور اپنی اصل کو بھول گیا ہے۔''

سورۃ الانفطار ۶-۸ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

''اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے ربِ کریم سے مغرور کر دیا؟ اس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا، تیرے اعضاء درست کیے، تیرے قویٰ میں اعتدال پیدا کیا اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترکیب دی۔''

ان آیات میں انسان کے تکبر، جبر وقہر، غرور کے سارے Attitude کو توڑا گیا ہے۔ انسان کو اس کی حقیقت سے روبرو کرایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کا فضل وکرم نہ ہوتا تو تم ان پستیوں سے اٹھ کر اپنے وجود کی اعلیٰ سطح پر فائز نہ ہونے پاتا۔

یہ مذکورہ آیات ہمیں انسان کی کمزوری اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اعتراف کرواتی ہیں اور انسان کی حیثیت مخلوق Creation کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔

ان آیات میں انسانی تصور کے جو زاویے پیش آئے ہیں وہ ہمارے اندر اخلاقی اقدار اور Selflessness کو بھی پروان چڑھاتی ہے۔ انسانی وجود کے ''میں'' جو افراط کی انتہائی تصور سے دنیا میں تخریب کی روشنی پر گامزن تھا اس کو دبا دیتی ہے۔ قرآن کا یہ تصور جو ان آیات میں وارد ہوا ہے انسان کی قہر وجبر کے انحطاط سے نجات دلاتا ہے۔

قرآنی انسانی تصور کا وہ نقشہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کرتا ہے جس نے گوشت کے اس لوتھڑے کو انسان جیسی اعلیٰ ارفع مخلوق بنایا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

''یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔''

سورۃ بنی اسرائیل میں قرآن کا ارشاد ہے:

''اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔''

سورہ حج میں قرآن فرماتا ہے:

''اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا ہے کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے لیے مطیع بنادیا ہے۔''

ان آیات میں انسان کے تفریط کے انتہائی تصور کو توڑا گیا ہے۔

دین وقرآن کی رو سے تصور انسان کے چند نمایاں پہلو:

انسان ایک باارادہ مخلوق ہے۔ اگرچہ اپنی تخلیقی ساخت میں انسان بے رحم جبریت قانون سے جکڑا ہوا ہے۔ لیکن انسان کو تصرف کے اختیارات بخشے گئے ہیں اور یہی اختیارات انسان کو دوسری تمام مخلوقات پر فوقیت دیتے ہیں۔ قرآن کی رو سے یہی حیثیت ہے جس نے انسانوں کو آزمائش وامتحان میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ حیثیت مجموعی طور پر ''نفس'' کے احاطے میں آتی ہے اور تزکیہ نفس اس آزمائش میں انسان کو ابدی کامیابی وکامرانی کا ضامن بناتی ہے۔

نفس کے حوالے سے احمد جاوید صاحب اپنے کتابچہ تزکیہ نفس میں فرماتے ہیں کہ نفس کے تین بنیادی اجزاء ہیں:

(۱) طبیعت (۲) ارادہ (۳) اور ذہن۔

مزید فرماتے ہیں کہ:

☆ طبیعت رغبت وبے رغبتی کا ماخذ ہے۔

☆ ارادہ صحیح اور غلط کی طرف پیش قدمی کی قوت ہے۔

☆ اور ذہن حق وباطل میں تمیز کرنے کا آلہ ہے۔

قرآن میں مومن کی جو خوبیاں دریافت کی گئی ہیں وہ تزکیہ نفس کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثلاً سورۃ المومنون وغیرہ میں وارد ہوا ہے۔

رسالت:

قرآن یا دین اسلام نے انسانی گروہ کی ضوفشاں شخصیات کو اعلیٰ ترین مقام عطا کیا ہے۔ اگرچہ ہر شخص کو یہ مقام (بعض رسالت و پیغمبری) عطا نہیں کی گئی۔ بلکہ یہ اعجاز انسانی تاریخ کے چند بزرگ ہستیوں کو عطا ہوتی ہے۔ اس ذیلی عنوان کا ذکر اس لیے ناگزیر ہے کیوں کہ دورِ جاہلیت اور مشرقی مذاہب کے مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کی دور رس نگاہ اس تصور سے کوسوں دور تھی کہ ایک انسان حیوانی وجود سے آشنا ہو اور اس میں کوئی مافوق الفطری عناصر نہ پایا جائے اور وہ خدا سے ہم کلامی یا براہِ راست تعلق کا کوئی دعوے پیش کرے۔ یہ بات انسانی ذہن کی بالادستی سے باہر تھی۔ اللہ تعالیٰ کے دین (قرآن) نے انسان کو یہ وقار عطا کیا کہ وہ لوازماتِ بشریت اور عام زندگی گزارتے ہوئے بھی رسالت کے مقام پر فائز رہ کر اپنی رسالت کی ذمہ داری کا حق ادا کرسکتا ہے۔

یہ تصور ہی عرب بدو کے گرفتِ حواس سے باہر کی شے تھی۔ جس وجہ سے اکثر افراد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے منکر بن بیٹھے تھے۔

عقیدۂ توحید:

ایمانیات میں توحید کا مقام سب سے اعلیٰ ہے اور دین میں توحید صرف عقیدے کی حیثیت ہی نہیں رکھتی بلکہ مومن کے دلوں پر حکمرانی بھی کرتی ہے۔ توحید کا یہ عقیدہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلاتا ہے اور مخلوق کی پرستش (Cult of Personality) کی جڑیں کاٹ دیتا ہے۔

توحید کے عقیدے نے انسان کے مقام کو کائنات میں مستحکم کردیا ہے۔ کائنات میں کسی بھی شے کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ انسان اس کا مسجود ہو۔ بلکہ انسان کی ہستی اپنی تخلیق کے روزِ اول ہی سے وقعت وعزت کے منار پر فائز رہی ہے۔ جس روز بارگاہِ خدا کے حضور ملائکہ جیسی ہستی نے انسان کے آگے سجدہ کیا۔

یہ تصور شرک کی تمام جہت اور اشکال کی جڑوں کو کاٹ دیتا ہے۔ انسان کے لیے اس سے بڑھ کر ضلالت و رسوائی کا کیا مقام ہوسکتا ہے کہ وہ ہر چوکھٹ پر اپنا سر پٹکتا رہے۔

قرآن کے تصورِ انسان نے انسانوں کو اس ضلالت سے نجات دلائی اور اس کے لیے معرفتِ الٰہی کی تکمیل کے لیے لائحہ عمل تجویز کیا ہے تاکہ روزِ مکافات کامیابی کی سند اس کے سپرد کی جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَى أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَى أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ۔ (۸) (سورہ الحجرات)

ترجمہ

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ مرد دوسرے مرد کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد توفسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔ اور جو لوگ اس روش سے توبہ نہ کریں تو یہی لوگ ظالم ہیں۔'' ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت زیادہ گمان کرنے سے بچو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور ٹوہ میں نہ لگو۔ اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؟ تم نے تو اس کو ناگوار جانا۔ اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔''

/rafeeqemanzil

Making Subscription Simple.

1

Scan QR code and subscribe RAFEEQ E MANZIL on our website.

2

Messege your full Name, Address (e.g street, locality, district, pin code, phone number) and Tariff on whatsaap (99 8545 8236) and payment with Google pay, Paytm, etc

3

Post your full Name, Address and Tariff and pay with money order on given address.

D-300, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla,
New Delhi - 110025 , +۹۱ ۹۹ ۸۵ ۴۵۸ ۲۳۶، officermgp@sio-india.org